# خواجہ احمد عبّاس

## کے شاہکار افسانے

# خواجہ احمد عباس کے شاہکار افسانے

مرتبہ

## شفیق الرحمان

ادبی ستون لاہور
بنک کالونی، سمن آباد، لاہور، پاکستان

ضابطہ
اگست ۱۹۹۱ ——— نقشِ اوّلین
ایس آر طارق برائے ادبی ستون سمن آباد لاہور
وحید نظامی برائے نظامی پرنٹرز ریٹی گن روڈ لاہور
قیمت ——— ۱٦٦/=

*We have arranged to provide you the books on cheepest rates at your home.*

**SHAFIQ BOOK BANK & SUBSCRIPTION AGY**

SHAMA ROAD MA MOZANG LAHORE

# ترتیب


| مضمون | صفحہ نمبر |
|---|---|
| واپسی کا ٹکٹ | ۵ |
| اجنتا | ۲۳ |
| بھولی | ۴۶ |
| آئینہ خانے میں | ۵۶ |
| دیوالی کے تین دیئے | ۶۵ |
| بنارس کا ٹھگ | ۷۴ |
| میری موت | ۹۱ |
| سلمہ اور سمندر | ۱۰۱ |
| ماں کا دل | ۱۲۷ |
| آج کے لیلیٰ مجنوں | ۱۳۷ |

# واپسی کا ٹکٹ

انسان نے انسان کو ایذا پہنچانے کے لیے جو مختلف آلے اور طریقے اختیار کیے ہیں اُن میں سب سے زیادہ خطرناک ہے ٹیلی فون! سانپ کے کاٹے کا منتر تو ہو سکتا ہے مگر ٹیلیفون کے مارے کو تو پانی بھی نہیں ملتا۔"

مجھے تو رات بھر اس کمبخت کے ڈر سے نیند نہیں آتی کہ صبح سویرے نہ جانے کس کی منحوس آواز سُنائی دے گی۔ دو ڈھائی بجے آنکھ لگ بھی گئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ساری دُنیا کی گھنٹیاں اور گھنٹے گھڑیال بیک وقت بجنے شروع ہو گئے۔ مندروں کے پیتل کے بڑے بڑے گھنٹے، پولیس کے تھانے کا گھڑیال، روازوں کی بجلی والی گھنٹیاں، سائیکلوں کی ٹرنگ ٹرنگ، فائر انجنوں کی کلینگ کلینگ۔ اور جب آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اس غیر وقت رات کو کس کا فون آیا ہے؟ ضرور ٹرنک کال ہو گی۔ پل بھر میں نہ جانے کتنے وہم دل دھڑکاتے ہیں۔ ایک دوست مدراس میں بیمار ہے۔ ایک رشتہ دار لندن اور بمبئی کے درمیان ہوائی جہاز میں ہے۔ بھتیجے کا میٹرک کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

مَیں فون اُٹھا کر کہتا ہوں۔ "ہلو۔"

دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے ——— "چُنی بھائی، کیم چھو۔"

مَیں کہتا ہوں کہ یہاں نہ کوئی چُنی بھائی ہے نہ کیم چھو۔
مگر وہ کہتا ہے ۔۔۔۔۔ "چنی بھائی۔ ٹاٹا ڈلیز ڈاؤن جا رہا ہے۔"
مَیں کہتا ہوں ۔۔۔۔ "جانے دو۔"
وہ گجراتی میں گالی دے کر کہتا ہے ۔۔۔۔۔ کیسے جانے دیں ۔۔۔۔۔ برٹش الیکٹرک کے سودے میں پہلے ہی گھاٹا کھا چکے ہیں۔" میں سمجھاتا ہوں کہ دیکھو بھائی میں چنی بھائی نہیں ہوں۔"

"اوہ!" ۔۔۔۔۔ ادھر سے آواز آتی ہے جیسے ایک دم ٹائر میں سے ہوا نکل گئی ہو ۔۔۔۔۔ "تم چینی بھائی نتھی چھو۔"
مَیں پوچھتا ہوں۔ "آپ کو کون نمبر چاہیئے۔"
وہ کہتا ہے۔" ایٹ ۔۔۔۔۔ سیون ۔۔۔۔۔ ایٹ ۔۔۔۔۔ سِکس ۔۔۔۔۔ سِکس ۔۔۔۔۔"
مَیں کہتا ہوں ۔۔۔۔۔ "یہ تو ایٹ سِکس۔ ایٹ سیون، سیون ہے۔"
وہ کہتا ہے، ڈانٹ کر۔ "تو پہلے ہی کیوں نہیں بولتے رونگ نمبر ہے۔"
مَیں کہتا ہوں "اچھا بھئی میرا ہی دوش ہے۔ اب شما کرو۔"
اور فون رکھ دیتا ہوں۔ اور نیند کو واپس بُلانے کے لیے بھیڑیں گِننا شروع کر دیتا ہوں۔
اور پھر صبح اُٹھ کر تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا سِلسلہ ہی شروع ہو جاتا ہے۔
"آپ مجھے نہیں جانتے۔ آپ کے پُرانے وطن پانی پت کے قریب جو قصبہ ہے رلیوا ڑی وہاں سے آیا ہوں، فلم کمپنی میں ہیرو بننے ۔ ۔ ۔ "
"مجھے آپ سے اپائنٹ منٹ چاہیئے۔ اپنی کہانیاں سُنانا چاہتا ہوں۔"
"اگلی اتوار کو ہماری انجمن کا سالانہ جلسہ اور مشاعرہ ہے آپ کو آنا ہی پڑے گا۔ ۔۔۔۔۔ آپ کے نام کا اعلان پہلے ہی کر چکے ہیں ۔ ۔ ۔"
"پرچہ پریس میں رکا پڑا ہے۔ صرف آپ کے مضمون کے انتظار میں ۔ ۔ ۔"
"دیکھیے۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ لیکن کیا آپ مجھے کرپا کر کے راجکپور کا ایڈریس دے سکتے ہیں؟"
کل سویرے کی بات ہے کہ یہی سِلسلہ چل رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی ۔۔۔۔۔ میں نے ہمت کر کے فون اُٹھایا۔
"ہیلو" ۔۔۔۔۔ مَیں نے کہا۔ حالانکہ ٹیلی فون کی ڈائرکٹری حکم دیتی ہے کہ "ہیلو" مت کہو۔
"ہیلو" دوسری طرف سے بڑے ہی یوریپین انداز کی آواز آئی۔ مَیں سمجھا کوئی امریکن یا

انگریز بول رہا ہے۔

پھر اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"کیا میں خواجہ احمد عباس سے بات کر سکتا ہوں؟"

میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا ——— "میں عباس ہی بول رہا ہوں۔ کہیے، کون صاحب بول رہے ہیں؟"

دفعتاً فون کے دوسرے سرے پر انگریز ہندوستانی میں بدل گئی مگر لہجہ ولایتی رہا۔ جیسے کوئی انگلستان سے پڑھ کر دس برس بعد حال ہی میں لوٹا ہو۔ کیوں بھائی میری آواز پہچان سکتے ہو؟

میں تکلفاً جھوٹ بولا ——— "آواز تو آپ کی جانی بوجھی معلوم ہوتی ہے لیکن معاف کیجیے گا۔"

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ بڑے بے تکلف انداز میں مگر لہجہ وہی ولایتی رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انگریزی فوج کا کرنیل ہندوستانی بول رہا ہو ——— "چھوڑو یار۔ تم میری آواز پورے پچیس برس بعد سن رہے ہو۔ آخری بار ہم لکھنؤ میں ملے تھے۔ اُنیس سو چھتیس میں۔"

نہ جانے کیسے میرے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی۔ میں نے کہا "برجیندر کمار سنگھ؟ برجو؟"

اُدھر سے آواز۔ "رائٹ، برجو۔"

برجو، میں نے خوشی سے چلا کر کہا ——— کہو بھئی اتنے دن کہاں رہے، کیا کرتے رہے؟ آج کل کیا کرتے ہو؟"

ٹیلیفون پر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دوسری طرف جواب دینے سے پہلے اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی ہو۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز بالکل ہی بدلی ہوئی تھی جیسے ایک دم کسی گہری فکر میں ڈوب گئی ہو۔ "یہ سب ایک لمبی کہانی ہے۔ کیا میں تم سے ابھی ملنے آسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "میں تو شہر سے بہت دور جوہو میں رہتا ہوں۔ مگر ہر روز دوپہر کو میں شہر آتا ہی ہوں۔ ایسا کیوں نہ کریں کسی ریستوران میں کھٹے لنچ کھائیں۔ اب یہاں بمبئی میں بھی تمہارے لکھنؤ کی طرح ایک مے فیر (MAYFAIR) ریستوران کھل گیا ہے۔"

"مے فیر؟" اس نے ریستوران کا نام ایسے دہرایا۔ جیسے دفعتاً کسی نے اس کی چٹکی لے لی ہو۔ "نہیں نہیں۔ میں تم سے کسی ریستوران میں نہیں ملنا چاہتا۔ وہاں بہت لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ہم اطمینان سے باتیں نہیں کر سکیں گے۔"

"اچھا" ——— میں نے کہا ——— "تو تم یہاں ہی آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ کتنے بجے آؤ گے؟"

"جتنی دیر ٹیکسی کو چرچ گیٹ سے جوہو پہنچنے میں ٹائم لگے گا۔"

"کوئی چالیس پینتالیس منٹ میں اپنے برآمدے میں کھڑا ملوں گا۔"

اگلے پینتالیس منٹ تک پچیس برس پُرانی تصویریں میرے دماغ میں اُبھرتی رہیں۔

برجو۔

برجیندر۔

برجیندر کمار سنگھ۔

کنور برجیندر کمار سنگھ۔

برجو۔

ہمارا یار برجو۔

برجو دی بیوٹی فل۔

برجو دی پریسنٹ۔

برجو جو خوبصورت تھا، قدآور تھا، ذہین تھا، ٹینس کا چمپئن تھا۔ اور یونین میں بہترین مُقرر تھا۔

برجو جس کے پیچھے درجنوں لڑکیاں دیوانی تھیں۔

ہائی کورٹ کے جج جسٹس سر رمیش سکسینہ کی بیٹی آشا سکسینہ جو آئی، ٹی کالج میں پڑھتی تھی۔

ڈاکٹر ستیش بنرجی کی لڑکی کرونا جس کی خوبصورت آنکھیں جیمنی رائے کی کسی تصویر سے چُرائی ہوئی لگتی تھیں۔

پروفیسر حامد علی کی چھوٹی بہن ثریا ماجد علی جس نے کرامت حسین گرلز اسکول کا پردہ دار ماحول چھوڑ کر یونیورسٹی میں اسی سال داخلہ لیا تھا اور جو ہر ڈبیٹ اور ڈرامے میں یونین ہال میں سب سے آگے بیٹھتی تھی تاکہ برجو کو دل بھر کر دیکھ سکے۔

سرلا ماتھر جو ہندی میں ایم۔ اے کر رہی تھی اور کویتا لکھتی تھی اور جس کی ہر کویتا میں برجو کا روپ جھلکتا تھا۔

موہنا جسپال سنگھ جو نہایت خوبصورت تھی اور ایک چھوٹے موٹے جاگیردار کی بیٹی تھی اور جس نے صرف برجو کی وجہ سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔

سلویا ٹامسن جو اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی تھی اور ریلوے کلب کے ہر ڈانس میں برجو کو دعوت دینے خود اس کے ہاسٹل جاتی تھی۔ حالانکہ وہاں لڑکیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

برجو ——

واقعی وہ کتنا قابلِ رشک نوجوان تھا۔

پہلی بار جب میری ملاقات اس سے ہوئی تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی آل انڈیا ڈبیٹ میں حصہ لینے لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے آیا تھا۔

چھبیس برس بعد بھی مجھے اس سے وہ پہلی ملاقات اچھی طرح یاد تھی۔ میں اپنی یونیورسٹی یونین کی طرف آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے اسٹیشن گیا۔ اس ٹرین سے لکھنؤ، الہ آباد، بنارس کان پور کے کالجوں کے ڈیبیٹر آئے تھے۔ کل ملا کر وہ سب شاید بارہ یا چودہ تھے لیکن ان سب میں ایک سب سے نمایاں تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ قد آور تھا اور بند گلے اور پوری آستینوں کے سوئٹر میں اس کا کسرتی بدن اپالو کے بُت کی طرح گٹھا ہوا اور سڈول تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اور جب میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس کے شیک ہینڈ میں بڑا خلوص تھا اور گرم جوشی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگوں سے مل کر اسے واقعی بڑی خوشی ہوئی ہے اسی ایک پل ہی میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں بڑے پرانے دوست ہوں۔ اور برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

پھر آل انڈیا ڈبیٹ ہوئی۔ موضوع زیرِ بحث یہ تھا کہ:

"سماجی انقلاب کے بغیر سیاسی آزادی کافی نہیں ہے"

میں اس موضوع کے خلاف بولا اپنی تقریر میں میں نے سامراج کے خلاف اور قومی آزادی کی تحریک کی حمایت میں نہایت جذباتی تقریر کی اور ان لوگوں کو خوب لتاڑا جو جنگِ آزادی کی قربانیوں، اور خطروں سے بچنے کے لیے سماج سُدھار کے گوشۂ عافیت میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ میری تقریر ختم ہوئی تو خوب زور کی تالیاں بجیں اور میں نے یہی سمجھا کہ میں نے میدان مار لیا ہے۔

میرے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے برجیندر کمار سنگھ کا نام پکارا گیا۔ اب وہ سفید فلالین کی پتلون پر بند گلے کا سیاہ جودھپوری کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لباس میں وہ بڑا ہی جچ رہا تھا۔ ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ اوپر گیلری میں جہاں چکوں کے پیچھے گرلز کالج کی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں، دلچسپی کی ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی اور چکوں کے بیچ میں سے سیاہ خوبصورت آنکھیں اور رنگین آنچل جھلملانے لگے۔

"مسٹر پریذیڈنٹ" اس نے نہایت شستہ انگریزی لہجہ میں تقریر شروع کی۔ مجھ سے پہلے میرے دوست نے جب اپنی تقریر ختم کی تو سب نے پُرجوش تالیاں بجائیں۔ میں نے بھی تالیاں بجائیں۔ وہ تقریر واقعی لاجواب تھی۔ میرے خیال میں بہترین تقریر کے لیے انعام میرے اس دوست ہی کو ملنا چاہیے۔ اس لیے کہ اتنے کمزور دلائل کو اتنی خوبصورتی اور اتنے زور و شور سے پیش کرنا واقعی بڑا کارنامہ ہے۔

اور اس سے پہلے کہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ وہ واقعی میری تعریف کر رہا ہے یا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ میرے دوست ایک بہت کامیاب وکیل ثابت ہوں گے۔۔۔" اور اس پر سارے ہال میں اتنے زور کا قہقہہ پڑا کہ اس کی لہروں میں میرے تمام زور دار دلائل بہہ گئے۔

اسے ڈبیٹ میں اوّل انعام ملا ——— مجھے دوسرا ——— وہ تین دن علی گڑھ ٹھہرا۔ پہلے دن وہ مسٹر بجیندر کمار سنگھ تھا۔ دوسرے دن صرف "برجو" رہ گیا۔ جب دلوں اور دماغوں کی ہم آہنگی ہو تو غیریت کے فاصلے کتنی جلدی دُور ہو جاتے ہیں۔

اسٹیشن پر جب میں اسے چھوڑنے گیا تو میں نے اس سے پوچھا تھا۔۔۔ "برجو یہ بات کہ سماجی انقلاب سیاسی آزادی سے زیادہ ضروری ہے۔ تم نے ایسی ہی ڈبیٹ کی خاطر اتنے زور و شور سے کہی یا تم واقعی اس میں اعتقاد رکھتے ہو؟"

پچیس چھبیس برس کے بعد بھی اس کا جواب میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے کہا تھا:

"سُنو! ملکوں اور قوموں کی آزادی ضروری ہے لیکن اتنی مشکل نہیں۔ سماجی انقلاب جو ہمارے دماغوں کو صدیوں کے تعصبات اور وہموں سے آزاد کرے وہ مشکل کام ہے، اور جب تک ہمارے دماغ آزاد نہیں ہوں گے ہمارے ملک کی سیاسی آزادی غیر مکمل رہے گی۔"

پھر اس نے اور بڑی پتے کی باتیں کہی تھیں۔ فرض کرو ہندوستان آزاد ہو گیا اور ہمارے تمھارے دماغ مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ تعصب اور نفرت کے بندھنوں سے آزاد نہ ہوئے تو ذرا سوچو کیا ہو گا۔ اتنے برسوں کی تعلیم اور سماج سُدھار کی باتیں کرنے کے بعد بھی ہم پڑھے لکھے ہندوؤں میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اپنے ذہنوں کو پوری طرح ذات پات کے بندھنوں سے آزاد کر لیا ہے؟ تم مسلمانوں میں کتنے ہیں جو سچ مچ شیخ، مغل، پٹھان، جلاہے کہار کو برابر سمجھتے ہیں؟"

میں نے اس سے پوچھا تھا۔۔۔ "اور برجو تم۔۔۔؟ کیا تمھارا دل اور دماغ ان بندھنوں سے آزاد ہے؟ کیا تم بڑے خاندان کے راجپوت ہو کر ایک اچھوت لڑکی سے بیاہ کر سکتے ہو؟ یا کسی طوائف زادی کو اپنی پتنی بنا سکتے ہو؟"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔۔۔ "اگر مجھے اس سے محبت ہو تو ضرور کر سکتا ہوں۔ اور وقت آیا تو کر کے دکھا دوں گا۔"

اور پھر اس کی ٹرین آ گئی اور وہ لکھنؤ واپس چلا گیا۔

اس کے بعد ہم ایک اور آل انڈیا ڈبیٹ کے سلسلے میں بنارس میں ملے تھے۔ اور سارناتھ کے کھنڈروں میں ساتھ گھومے تھے اور برجو نے مجھے نہاتما بدھ کے حالاتِ زندگی سُنائے تھے اور کہا تھا:

"—— اگر دھرم اور مذہب کے خیال ہی سے میں بیزار نہ ہو گیا ہوتا تو ضرور بدھ مت اختیار کر لیتا ——"

جانتے ہو مہاتما بدھ کا دیہانت کیسے ہوا؟ اس نے میوزیم میں مہاتما بدھ کی شانت اور مسکراتی ہوئی مورتی کے سامنے کھڑے ہوئے مجھ سے کہا تھا —— "وہ ایک غریب اچھوت کے ہاں بھیک مانگنے گئے اور اس بیچارے کے پاس گھر میں صرف سڑا ہوا سور کا گوشت تھا۔ وہی اس نے جھولی میں ڈال دیا۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ گوشت سڑ گل کر زہریلا ہو چکا تھا انھوں نے اسے کھا لیا جان دے دی مگر کسی غریب اچھوت کا دل نہیں توڑا ——"

پھر جب ہم یہی باتیں سوچتے ہوئے تانگے میں شہر واپس ہو رہے تھے ہم نے دیواروں پر دیو داس فلم کے اشتہار لگے دیکھے تھے اور برجو نے کہا تھا —— "اور ایک بھائی دیو داس تھے کہ پاروتی کو تو مندھار میں چھوڑ ہی تھا چندرا کا دل بھی توڑ دیا۔ اور شراب کے سمندر میں ڈوب گئے۔ مگر سماج نے انسانوں کے درمیان جو کھائیاں کھود رکھی ہیں ان کو پار نہ کر سکے۔"

میں نے کہا تھا —— "دیو داس کوئی فرضی فلمی ہیرو نہیں تھا۔ شرت بابو نے ایک معمولی انسان کا کردار دکھایا ہے جو سماج کے مقابلے میں ہماری تمھاری طرح کمزور تھا۔"

اور اس نے ہنس کر کہا تھا —— "تمھاری طرح کمزور ہو گا۔ اگر یہ صورتِ حال مجھے پیش آئی تو میں کمزور ثابت نہیں ہوں گا ——"

اس رات ہم لوگ بنارس سے رخصت ہو رہے تھے لیکن ہماری ٹرینیں آدھی رات کے بعد روانہ ہونے والی تھیں۔ میری ٹرین ڈیڑھ بجے اور برجو کی ٹرین پونے تین بجے۔ ڈبیٹ کیلئے اور جتنے طالب علم مختلف یونیورسٹیوں سے آئے تھے وہ سب جا چکے تھے۔ صرف میں اور برجو رہ گئے تھے اور ہماری دیکھ بھال کرنے کے لیے بنارس یونیورسٹی کا ایک ایم اے کا طالب علم تھا گوند سکسینہ۔

کھانے کے بعد ہم باتیں کر رہے تھے کہ گوند نے کہا —— "رہل میں تو ابھی کئی گھنٹے ہیں چلیے آپ لوگوں کو گانا سنوا دیں ——"

میں نے اس وقت تک بھی کسی طوائف کا گانا نہیں سنا تھا، مگر بنارس کی گانے والیوں کی بڑی تعریف سنی تھی کہ پکے گانے، دادرا اور ٹھمری میں ان کا جواب نہیں۔ سو میں نے کہا "یہ اچھا خیال ہے چلو برجو ——"

مگر اس نے کہا —— "چھوڑو جی۔ اچھے خاصے یہاں گپ شپ کر رہے ہیں وہاں کوئی کالی موٹی بھدی بائی جی پان کھا کھا کے پکا گانا سنائیں گی اور ہمیں بور کریں گی ——"

اس پر گوند بولا۔۔۔ "تم لکھنؤ والے سمجھتے ہو کہ لکھنؤ کے چوک کے باہر حسن کہیں ہے ہی

نہیں ——— ارے ایک بار لکشمی کو دیکھ بھی لوگے تو نہ جانے لکھنؤ کی کتنی ریلیں نکل جائیں گی۔"
مگر برجو نہیں مانا۔ تمھاری لکشمی بائی تم بنارس والوں کو مبارک ——— اور سچی بات یہ ہے کہ کوٹھے والیوں کا گانا سننے میں اپنے کو کوئی دلچسپی نہیں۔"
اور مجھے کہنے کا موقع مل گیا . . . "کیوں سماج سُدھارک جی ویشیا کے گھر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیا . . . ؟"
برجو کو کہنا ہی پڑا . . . "ڈر تو مجھے شیطان کے گھر جاتے ہوئے بھی نہیں لگتا . . ." اور سو ہم لوگ تانگے لے کر لکشمی کے کوٹھے کے لیے روانہ ہو گئے۔
اتنے برسوں کے بعد بھی لکشمی کی صورت کو میں نہ بھولا تھا۔
چھوٹا سا بوٹا سا قد، گدرایا ہوا جسم، گوری تو نہیں مگر سنہری رنگت، گھنے لمبے بال جن کو دو چوٹیوں میں گوندھا ہوا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اور بوجھل لمبی پلکیں۔ لالی رنگے ہونٹ جن پر ایک مجیب سی اُداس سی مسکراہٹ سی کھیل رہی تھی۔ چھوٹی سی مگر بڑی خوبصورت سی ناک جس میں ہیرا جڑی ایک چھوٹی سی نتھنی پڑی ہوئی تھی۔ گوند نے میرے کان میں کہا . . . "اس نتھنی کو اتارنے کے لیے ایک جاگیردار صاحب پچاس ہزار تک پیش کر چکے ہیں . . ."
مجرا شروع ہوا۔ ہمیں ماننا پڑا لکشمی جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی سریلی اس کی آواز ہے۔ ٹھمری کے بعد دادرا اور دادرا کے بعد غزل ——— گوند کی فرمائش پر ایک آدھ فلمی گیت بھی ہوا۔ محفل میں کتنے ہی لوگ تھے جو بھوکی نظروں سے لکشمی کو گھور رہے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ خود لکشمی کی نگاہیں برجو کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔
آہستہ آہستہ محفل بکھرتی گئی۔ اپنی اپنی جیبیں خالی کر کے لوگ اُٹھتے گئے۔ پھر صرف ہم لوگ رہ گئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کہا . . . "میری گاڑی کا تو وقت ہو گیا۔ چلو بھئی گوند . . ."
گوند میرے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جب برجو نے اُٹھنا چاہا تو لکشمی نے اپنا مہندی لگا چھوٹا سا نرم سا ہاتھ اس کے سخت ٹینس کھیلنے والے ہاتھ پر رکھ دیا . . . "آپ کو ہماری قسم کنور صاحب لکھنؤ کی گاڑی میں تو ابھی بہت دیر ہے . . ."
برجو نے حیران ہو کر پہلے میری طرف دیکھا پھر گوند کی طرف۔ اور پھر لکشمی کی طرف جس کا ہاتھ اب تک اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ ہمارے ساتھ اُٹھنا بھی چاہتا ہے اور لکشمی کو مایوس کرنا بھی نہیں چاہتا۔
میں نے انگریزی میں کہا۔ شام کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے THIS MEAT IS POISOND

اس گوشت میں زہر ہے "

برجو نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"جانتا ہوں۔ مگر کسی کا دل دکھانے سے زہر کھا لینا بہتر ہے "

"چلو گوند ہم چلتے ہیں" میں نے کسی قدر چڑ کر کہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرا ایک عزیز دوست یک گندی نالی میں گر پڑا ہے اور وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا۔

"اچھا تو پھر اگلے سال لکھنؤ کی ڈبیٹ میں ملیں گے۔" برجو نے مجھ سے صلح کرنے کے لئے آواز دی مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ برجو کا جو خیالی مجسمہ میں نے اپنے من میں بنایا تھا اس لمحے میں وہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سماجی انقلاب پر تقریر کرنے والا برجو، مہاتما بدھ کے پوتر ارگ پر چلنے والا برجو ایک معمولی رنڈی باز نکلے گا۔

غصے سے بھرا میں زینے سے اتر ہی رہا تھا کہ آواز آئی "سنئے" مڑ کر دیکھا تو لکشمی تھی۔ اس کا ہرہ تمتمایا ہوا تھا اور اس کے لبوں کے کنارے کانپ رہے تھے۔

"میں نے آپ کے دوست کو روک لیا" وہ بولی۔ "اس کے لئے میں آپ سے شما مانگتی ہوں"۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور مڑ کر جانے لگا۔ اس پر اس کی آواز میں تیر کی سی تیزی تھی۔ "جانے سے پہلے یہ سنتے جائیے کہ میں انگریزی سمجھتی ہوں اگر میں زہریلا گوشت ہوں تو کبھی یہ بھی سوچئے گا میرے جیون میں یہ بس کس نے گھولا ہے۔"

میں کوئی جواب نہ دے سکا اور وہاں سے چلا آیا۔

اگلے برس جب میں لکھنؤ آل انڈیا ڈبیٹ کے لئے گیا تو میں اس واقعہ کو تقریباً بھول چکا تھا۔ نیورسٹی کے طالب علموں کا کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سننے جانا یا وہاں رات بھر کے لئے بھی ٹھہر جانا ئی ایسا غیر معمولی سانحہ نہیں کہ اس پر برسوں سوچ بچار کی جائے۔ برجو کا رویہ اس وقت مجھے ضرور را لگا تھا۔ مگر بعد میں میں نے یہ سوچ کر اسے معاف کر دیا تھا کہ جوانی میں ایک آدھ بار کس کے پیر یں لڑکھڑاتے۔

وہ اسٹیشن پر مجھے لینے آیا تھا اور اگلے تین دن تک تقریباً وہ ہر وقت میرے ساتھ ہی رہا۔ ہ بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر چکا تھا اور اب ایم اے میں پڑھ رہا تھا کہنے لگا "میرے ماں باپ چاہتے ہیں میں آئی، سی، ایس کے مقابلے میں شریک ہوں۔ لیکن میں سرکاری نوکری کرنا نہیں چاہتا

میں نے پوچھا "تب کیا کرو گے؟"

بولا "ایم اے کر کے کسی چھوٹے موٹے کالج میں لیکچرر ہو جاؤں گا۔ یا ایل ایل بی کر کے وکالت روں گا۔ ورنہ تمہاری طرح میں بھی جرنلزم کے میدان میں آکودوں گا۔

اس نے مجھے پورے لکھنؤ کی سیر کرائی۔ اور اس بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑکیوں میں کتنا مقبول ہے۔

ہم یونیورسٹی یونین کے کیفے میں چائے پی رہے تھے کہ کرونا بنرجی مل گئی اور کہنے لگی۔ دیکھو مسٹر برجنیدر کو مارا مارے بنگالی کالج کے پروگرام میں زور ور آنا۔ ہم گرو دیو کا ناٹک رکتو کر و بی کر رہے ہیں۔"

اور جب برجو نے کہا، کرونا میرا آنا تو مشکل ہے۔ یہ میرے دوست علی گڑھ سے آئے ہوتے ہیں۔ ان کو لکھنؤ کی سیر کرار ہا ہوں، تو وہ بولی، "تو اپنے فرینڈ کو بھی لے آئیے نا پلیز" اور اُس کی جیمنی رائے کی تصویر جیسی بنگالی آنکھوں میں پیار ہی پیار بھرا ہوا تھا۔

وہاں سے مجھے وہ لائبریری دکھانے لے گیا تو سرلا ماتھر سے ملاقات ہوگئی جو برجو کو کوی سمیلن میں مدعو کرنے کے لئے تلاش کر رہی تھی۔ وہ بولی" برجنیدر جی! یہ میں نے ایک نئی کویتا لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر بتائیے کہ کیسی ہے میں کوی سمیلن میں بھی پڑھنے والی ہوں۔ جب وہ چلی گئی تو برجو نے کویتا مجھے دکھائی۔ عنوان تھا، میرے سپنے،، اور دو ہی سطریں سن کر میں جان گیا کہ اس بیچاری کے سارے سپنوں کا مرکز برجو ہی تھا۔

شام کو ٹینس کلب میں آشا سکینہ سے ملاقات ہوئی جن کا اصرار تھا کہ برجو ٹینس ٹورنامنٹ میں مکسڈ ڈبلز کے لئے ان کا پارٹنر بن جائے اور جس انداز سے وہ اسے" پارٹنر پارٹنر" کہہ کر بلا رہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں برجو کو زندگی بھر کا" پارٹنر،، بنانے میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔

مے فیر ریسٹوران میں چائے پینے گئے تو وہاں ایک نہایت خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی" ہیلو برجو" کہہ کر دوڑی اور جب برجو نے اس کا تعارف کرایا تو معلوم ہوا وہ ہے موہنا جسپال سنگھ میں نے دیکھا اس کی کاجل لگی آنکھوں میں برجو کو دیکھتے ہی ایک عجیب سی آگ چمک اٹھی ہے اور نہ جانے کیوں مجھے ان بھوکی، سلگتی ہوئی آنکھوں سے ڈر سا لگا۔

اگلے دن میں نے برجو سے پوچھا۔ ارے یار تم بڑے خوش قسمت ہو کہ یہ سب لڑکیاں تم پر مرتی ہیں۔ مگر اب تک یہ نہ پتہ چلا کہ تم کس سے دلچسپی لیتے ہو۔ یا سب سے ہی فلرٹ کرتے ہو؟۔

وہ بولا۔ میں کس میں دلچسپی لیتا ہوں وہ کوئی اور ہی ہے اور اس سے میں بہت جلد شادی کرنے والا ہوں۔

میں نے کہا۔ اگر ان سب حسین اور اسمارٹ لڑکیوں کو چھوڑ کر تم نے کوئی اور پسند کی ہے تو وہ واقعی کوئی خاص چیز ہوگی۔ ہمیں بھی ملاؤ۔

اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ خاص چیز تو ہے وہ۔ اسی لئے میں نے اسے پردے میں رکھ چھوڑا ہے

میں نے کہا: ہم مسافروں سے کیا پردہ۔ ہم تمہارے رقیب نہیں ہیں یار۔"
"تو پھر آج شام کو چار بجے مے فیر ریستوران میں چائے پیو اور اس سے ملو۔"
"کون۔ موہنا؟"
"نہیں موہنا تو بور ہے۔ اگرچہ میرے ماتا پتا اس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ وہ ایک جاگیردار کی بیٹی ہے لیکن جس سے میں تمہیں ملانا چاہتا ہوں وہ کوئی اور ہی ہے۔"
چار بجے مے فیر میں داخل ہوا تو ایک کونے کی میز پر برجو کے پاس سفید ساڑی میں ملبوس ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ میں بالکل قریب پہنچ گیا تب بھی اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔
تم ان سے مل چکی ہو؟" برجو نے کہا اور سفید ساڑی والی لڑکی نے مڑکر مجھے دیکھا۔
وہ لکشمی تھی!
نمستے!" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔
نمستے!" میں نے نہایت بد دلی سے جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ کر بینڈ کی دھن سننے لگا۔
اس شام کو گومتی کے کنارے گھومتے ہوئے گھنٹوں میں اور برجو اس مسئلے پر باتیں کرتے رہے۔
میں نے کہا، برجو تم پاگل ہو گئے ہو کہ موہنا جیسا لڑکا اور آشا سکسینہ اور کرونا نبرجی اور سہ لاماتھر جیسی خوبصورت پڑھی لکھی بڑے خاندانوں کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس طوائف سے شادی کر رہے ہو۔
لکشمی طوائف نہیں!" اس نے غصّے سے کہا۔"
"طوائف نہ سہی طوائف زادی سہی، مگر تم نے اس میں کیا دیکھا ہے جو ساری دنیا کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اسے پسند کیا ہے؟"
وجہ تو ایک ہی ہے، میرے دوست۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ میری خاطر اپنے گھر والوں کو، اپنے پیشے کو اپنے ماضی کو چھوڑ کر چلی آئی ہے۔ اگلے مہینے ہم شادی کرنے والے ہیں۔
اور تم سمجھتے ہو کہ تمہارے گھر والے تمہیں اس حماقت کی اجازت دے دیں گے؟"
مجھے ان کی اجازت نہیں چاہئے۔ زندگی کے ایسے فیصلوں کے لئے کسی کی اجازت نہیں چاہئے۔ ماں باپ کی بھی نہیں، دوستوں کی بھی نہیں۔
شکریہ۔" میں نے بڑی تلخی سے کہا تھا۔ تو پھر مجھے یہ سب کیوں سنا رہے ہو؟"
چلتے چلتے رک کر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ تمہاری اجازت نہیں چاہئے، تمہاری مجبت چاہئے۔ دوست جج بن کر اپنے دوستوں کے اعمال کی جانچ پڑتال نہیں کرتے ان کو اپنی

دوستی اور محبت کی چھاؤں میں پناہ دیتے ہیں

اس کے بعد میرا کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں نے صرف اتنا پوچھا تھا۔ تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

اس نے کہا تھا۔ کل میں اپنے وطن جا رہا ہوں۔ اپنے ماں باپ کو اس فیصلے کی اطلاع دینے۔ ماتا جی بیمار ہیں اس لئے خط لکھ کر ان کو ایک دم SHOK دینے کے بجائے خود جا کر انھیں زبانی سمجھانا چاہتا ہوں اور اگر وہ لوگ راضی نہ ہوئے تو؟

تو ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر یہ شادی ہوگی۔ اور اس کے کہنے کے انداز میں اتنی قطعیت تھی کہ میں خاموش ہو گیا۔

اگلے دن ہم اکھٹے ہی اسٹیشن پر گئے۔ پہلے اس کی گاڑی جاتی تھی اس کے بعد میری۔ ٹکٹ کھڑکی پر جا کر جب اس نے کہا۔ ایک فرسٹ کلاس شام نگر۔ تو بابو نے پوچھا۔ سنگل یا ریٹرن،،

،،ریٹرن،، اس نے بڑے زور سے کہا۔ ہمیشہ واپسی کا ٹکٹ ہی لینا چاہئے۔

لکشمی بھی اسے چھوڑنے اسٹیشن پر آئی تھی۔ جب گارڈ نے سیٹی دی اور جھنڈی ہلائی اور برجو اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہوا تو لکشمی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

،،اری پگلی۔ گھبراؤ نہیں،، برجو نے چلتے چلتے چلا کر کہا،، میں تو پرسوں ہی لوٹ آؤں گا۔ یہ دیکھ تین دن کا ریٹرن ٹکٹ۔

ریل چل پڑی تھی۔ اور ریل میں برجو تھا۔ برجو کے ہاتھ میں ایک ہرا واپسی کا ٹکٹ تھا۔ پھر ریل آگے جا کے اپنے دھوئیں کے بادل میں کھو گئی۔ اور اب نہ ریل تھی نہ برجو اور نہ وہ واپسی کا ٹکٹ اور اب پلیٹ فارم پر صرف لکشمی تھی۔ لکشمی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان آنسوؤں میں پریتم سے بچھڑنے کا غم بھی تھا اور اس سے جلد پھر ملنے کی آرزو اور امید بھی تھی۔

میں علی گڑھ واپس چلا آیا۔ امتحان کی تیاریوں میں لگ گیا۔ چند ہفتے میں نے برجو کے خط کا انتظار کیا۔ مگر کوئی خط نہ آیا۔ میں نے سوچا۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے شاید ہنی مون پر کہیں گئے ہوں۔ پھر امتحان کے چکر میں سب کچھ بھلانا پڑا۔ امتحان ختم ہوا تو مجھے نوکری کے سلسلے میں بمبئی آنا پڑا۔ نئے نئے کام کا ایسا چکر پڑا کہ علی گڑھ، لکھنؤ، برجو، لکشمی سب پرانی یادیں بن کر کھو گئے۔ ۱۹۴۳ء کا سیاسی ہنگامہ آیا۔ ۱۹۴۶ء میں فساد اور خون خرابے ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی آئی۔ میں کئی بار دنیا کے سفر کو گیا۔ زندگی میں کتنی ہی خوشیاں اور کتنے ہی غم آئے اور بگولوں کی طرح گزر گئے۔ کتنی ہی کامیابیوں اور ان سے بھی زیادہ پریشانیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا پھر بھی برجو اور لکشمی کی یاد ایک سوالیہ نشان بن کر میرے دل کے ایک کونے میں دبکی رہی اور اس صبح جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، وہ سوالیہ نشان دن دہاڑے ایک بھوت بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

اس بار گھنٹی بجی تو وہ ٹیلیفون کی نہیں تھی، دروازے کی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ ایک ڈھیلی سی ملگجی سی بش شرٹ اور پتلون پہنے ایک بوڑھا سا آدمی کھڑا موٹے موٹے شیشوں کے عینک سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا پورٹ فولیو تھا۔ جیسا انشورنس ایجنٹ رکھتے ہیں۔ عین اسی وقت جب میں اور برجو جو پچیس برس بعد ملنے والے تھے یہ بوڑھا انشورنس ایجنٹ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔

کیا چاہیئے؟" میں نے قدرے درشتی سے پوچھا۔

جھریوں دار گہرے سانولے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا۔ کیوں بھول گئے؟"

برجو! اگلے لمحے ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔

میں بہت بدل گیا ہوں گا؟" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ تم نے بھی نہیں پہچانا۔

یہ واقعہ تھا کہ پچیس برس پہلے کے برجو اور اس بوڑھے میں کوئی دور کی بھی مشابہت نہ تھی میں نے سوچا ضرور بے چارہ سخت بیمار رہا ہوگا۔ تبھی تو اس کے چہرے اور بازوؤں پر کھال اسطرح لٹکی ہوئی ہے جیسے اس کے ڈھیلے کپڑے۔ میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ پچیس برس میں ہم سب ہی بدل گئے ہیں۔ مجھے ہی دیکھو چندیا بالکل صاف ہوگئی ہے۔

اس نے کہا۔ میں نے تمہارا نام ٹیلیفون ڈائرکٹری میں تلاش کیا۔ امید تو نہ تھی تم ملو گے۔ سنا ہے اکثر ہندوستان سے باہر رہتے ہو۔

ٹیلیفون کے ذکر پر میں نے کہا "میں تو فون پر تمہاری آواز سن کر سمجھا تھا کوئی انگریز یا امریکن ہے جس سے میں کہیں سفر میں ملا ہوں گا۔"

"اوہ میرا ACCENT ایکسنٹ؟ میں بھی تو کتنے ہی برس انگلستان میں رہا ہوں۔ ویسے ہی بات کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔"

نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بات کہنا چاہتا ہے اور اسی بات کو چھپانا بھی چاہتا ہے۔

کئی قسم کے خیالات اور خدشے میرے دماغ میں آئے

شاید اس کی نوکری چھٹ گئی ہے۔ بیکار ہے۔ شاید مدد مانگنے آیا ہے۔ شاید اس کو شراب کی لت پڑ گئی ہے تب ہی بہکا بہکا سا لگتا ہے اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کانپتی ہیں۔

شاید اس نے کوئی جرم کیا ہے۔ اس لئے اس کی آنکھیں بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہیں

کچھ سیکنڈ تک ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے میں اپنے ماضی کی تلاش کرتے رہے۔

پھر میں نے کہا۔ کیوں بھئی اکیلے ہی آئے ہو۔ بھابی ساتھ نہیں ہیں کیا؟"

اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ "میں نے طلاق لے لی ہے۔"

لیکن اب کم سے کم اس کی پریشانی کی وجہ تو معلوم ہو گئی۔ اتنے برسوں کے شدید عشق کے بعد اگر طلاق کی نوبت آئی ہے تو اس حالت پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے تھا۔

میں نے کہا۔ بڑا افسوس ہے برجو، لیکن ہوا کیا جو طلاق لینی پڑی؟ اس عمر میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔"

"میاں بیوی!" اس نے دونوں لفظوں کو کسی کڑوی دوا کی طرح تھوکا۔ پہلے دن ہی سے ہماری شادی ایک جھوٹ تھی۔ ایک بھیانک غلطی تھی۔ چوبیس برس تک میں نے اس غلطی سے نباہ کیا۔ اس جھوٹ کو سچ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں کامیاب نہ ہوا۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ میرے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی وہ بے چارہ مجھ سے کوئی صلاح مشورہ کرنے کے لئے نہیں اپنے دل کا بخار نکالنے کیلئے آیا تھا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے ایک سگار جلایا اور منہ سے دھوئیں کا ایک بادل اڑاتا ہوا بولا "تم سوچ رہے ہو نا کہ میں اتنے برس کہاں غائب رہا۔ شادی کے فوراً بعد ہی میں بیوی کو اپنے ماں باپ کے پاس چھوڑ کر انگلستان چلا گیا۔ آئی سی ایس کا امتحان دیا اور بدقسمتی سے پاس ہو گیا۔

"تو تم آئی سی ایس میں تھے۔ اور ہمیں کبھی پتہ ہی نہ چلا؟"

میں کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ تم لوگ ان دنوں سرکاری نوکریوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے۔ ستیاگرہ کر کے جیل جا رہے تھے میں کس منہ سے تم لوگوں کے سامنے آتا۔ اس لئے میں نے جان بوجھ کر ایسے ایسے مقام چنے جہاں کسی پرانے دوست سے ملاقات نہ ہو۔ پہلے کئی سال فرینٹر میں رہا پھر آسام میں۔ پھر کورگ میں وہیں ہمارا پہلا لڑکا پیدا ہوا۔۔۔۔۔"

کتنی ہی دیر وہ دھوئیں کے بادلوں میں نہ جانے کیسی کیسی تصویریں بناتا اور بگاڑتا رہا۔

پھر بولا۔ "مگر وہ لڑکا ہمارا نہیں تھا۔ وہ اس کا لڑکا تھا۔ جو میرے ایک چپراسی سے پیدا ہوا تھا جب مجھے معلوم ہوا تو تم سمجھ سکتے ہو کہ میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ چند مہینے تک تو میں بالکل پاگل ہو گیا۔ شراب تو میں پہلے بھی پیتا تھا لیکن اب میں اپنی ذلت کو ڈبونے کے لئے اندھا دھند پینا شروع کر دیا۔ جب وہسکی سے کام نہ چلا تو کونین کھانے لگا۔ تین مہینے پاگل خانے میں علاج کرایا۔ اور جب علاج کر کے حواس پر کسی قدر قابو پایا اور باہر نکلا تو نوکری سے استعفیٰ دینا پڑا۔ ذلیل ہو کر نکالے جانے سے یہی بہتر تھا کہ میں خود ہی بیماری کا بہانہ کر کے وقت سے پہلے پنشن کی درخواست دے دوں۔ میں نے اس کی منت کی کہ مجھے طلاق دے دو اور بچے لے جاؤ۔ میری ساری پنشن لے لو۔ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اپنی

نئی زندگی بنا سکوں۔ لیکن وہ نہ مانی۔ بولی، تم نے میری زندگی تباہ کی ہے اب تم مجھ سے اتنی آسانی سے چھٹکارا نہ پاؤ گے۔"

پھر؟" میں نے نرمی سے کہا۔

پھر میں ان دونوں کو لے کر انگلستان چلا گیا۔ ہندوستان میں اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھا۔ پشن بیچ کر جتنا روپیہ وصول ہوا اس سے میں نے لندن میں مکان خرید لیا۔ ایک حصے میں ہم خود رہتے تھے اور باقی میں ہندوستانی اور افریقین طالب علم کرایہ دے کر رہتے تھے بس یہی ہمارے گزارے کی صورت تھی۔

"پھر؟"

پھر وہی پرانی کہانی دہرائی جاتی رہی۔ اب مجھ میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ میں اس بدکار سے کچھ باز پرس بھی کر سکتا۔ رات کو جب تک "پیاؤ" بند نہ ہوتا میں وہاں بیٹھا شراب پیتا رہتا تھا اور وہ نوجوان طالب علم کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرتی تھی۔ دس سال میں تین اور بچے ہو گئے۔ ایک بالکل کالا۔ ایک سانولا۔ ایک گورا۔

مجھے اپنے دوست کی حالت پر رحم بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول ہی پڑا۔ اور تم نامردوں کی طرح سب دیکھتے رہے۔ اور تم سے یہ نہ ہوا کہ دو جوتے رسید کرتے اور نکال باہر کرتے اس چھنال کو۔ میں نے چوبیس برس ہوتے تم سے کہا تھا۔ برجو رنڈی کی بیٹی سے سوائے بے وفائی کے تم اور کچھ نہ پاؤ گے۔"

رنڈی کی بیٹی؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔

ہاں ہاں رنڈی کی بیٹی لکشمی!" میں نے نفرت سے بھرپور لہجے میں وہ نام لے ہی ڈالا جو اتنی دیر سے ہم دونوں کے درمیان ایک پہیلی بنا ہوا تھا جس کو بوجھنے کی ہمت نہ مجھ میں تھی نہ اس میں۔

لکشمی؟" اس نے ایسے لہجے میں دہرایا جیسے عمر میں پہلی بار یہ نام سنا ہو۔ پھر وہ بے اختیار ہنس پڑا اور ہنستا رہا۔ ہنستا رہا۔ ایک قہقہے کے بعد دوسرا قہقہہ، اسے ہنسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ لیکن اس ہنسی میں ایک کھوکھلی سی آواز ہی آواز تھی کوئی مسرت نہ تھی۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔

تو تم سمجھ رہے ہو کہ میں اب تک تم سے لکشمی کا ذکر کر رہا ہوں؟"

تو اور کیا؟" میں نے کہا، اسی سے تو تم نے شادی کی تھی نا؟"

کاش ایسا ہی کیا ہوتا۔ دوست اس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سی سانس بھر کر کہا۔ مگر جس سے میری شادی ہوئی وہ طوائف کی بیٹی لکشمی نہیں تھی ——— ایک جاگیردار کی بیٹی موہنا تھی۔

موہنا۔ اور میں نے اس حسین چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی جو میں نے لکھنؤ کے مے فیر سینما میں دیکھا تھا۔ اور پچیس برس کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ کاجل کا حاشیہ لگی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب آگ چمک رہی تھی۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن اسی آگ میں برجو کی زندگی جھلس جائے گی۔ ، اور لکشمی؟ میں نے پوچھا۔ لکشمی کا کیا ہوا؟ ، آخری بار جب ہم لکھنؤ میں ملے تھے مجھے یاد پڑتا ہے تم تین دن کا واپسی کا ٹکٹ لے کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ اپنے ماں باپ کو اس شادی کی اطلاع دینے؟ ،

جواب میں اس نے کچھ نہ کہا۔ جیب سے ایک پرانا بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ۔ اس کاغذ کی تہوں میں سے ایک ریلوے ٹکٹ کا آدھا حصّہ نکالا جو برسوں کے بعد اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اس پر چھپے ہوتے سب حرف غائب ہو گئے تھے۔ صرف اس کے سائز سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی یہ ریٹرن ٹکٹ کا واپسی والا آدھا حصّہ رہا ہو گا۔

اب میں کچھ کچھ سمجھا کہ کیا ہوا ہو گا۔

تو جب تم گھر پہنچے تو کنور صاحب اور کنور رانی کو قائل نہ کر سکے؟ تمہارے ماتا پتا نے تمہیں جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی؟"

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔

انھوں نے تمہیں لکھنؤ واپس جانے سے بھی روک دیا؟"

اس کے سر کی جنبش نے اثبات میں جواب دیا۔

انھوں نے زبردستی تمہاری شادی اپنے جاگیردار دوست کی بیٹی موہنا سے طے کر دی؟ انھوں نے تمہیں انگلستان بھیجنے کا لالچ دیا۔ انھوں نے تمہیں ڈرایا کہ اگر تم نے طوائف کی بیٹی سے شادی کر کے سماج میں طوفان برپا کیا تو تمہیں نہ صرف آئی سی ایس سے ہاتھ دھونا پڑے گا بلکہ کوئی بھی معقول نوکری نہ مل سکے گی۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا ایسا ہمارے ملک میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ فلموں میں بھی۔ زندگی میں بھی۔ اور اُن دنوں میں تو اور بھی کچھ ہوتا تھا۔ سماجی انقلاب کے بارے میں تقریر کرنا اپنی زندگی میں انقلاب لانے سے زیادہ آسان تب بھی تھا اور اب بھی ہے۔"

اپنی اسی کمزوری کا خمیازہ آج تک میں بھگت رہا ہوں۔ میں جو دیو داس کی کمزوری پر ہنستا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایسی باتیں کر کے اپنے آپکو سزا دینا چاہتا ہے۔

۔ اور سنو ریٹرن ٹکٹ کی تین دن کی مدّت گزر گئی اور تم لکھنؤ واپس نہ آئے اور واپسی کا حصّہ

بے کار تمہاری جیب میں پڑا رہا؟"

یہی تو مشکل ہے، میرے دوست۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ "زندگی کے سفر میں ریٹرن ٹکٹ نہیں ملتا۔ جہاں سے ہم چلے ہیں اور جن مقاموں سے گزرے ہیں ہزار کوشش کرنے پر بھی ہم وہاں لوٹ کر نہیں جا سکتے۔

تو اب کیا ارادہ ہے؟ میں نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

برجو نے کہا۔ میں نے موہنا کو لندن کا گھر دے دیا ہے۔ اپنی ساری جائیداد اس کے نام لکھ دی ہے۔ اس قیمت پر وہ مجھے طلاق دینے پر راضی ہوئی ہے۔

"تو کیا وہ ——— موہنا ——— ہمیشہ سے ایسی تھی؟"

۔ نہیں۔ تب ہی تو پچیس برس نباہ کرنے کی کوشش کی میں نے:

پھر ایسی کیسے ہو گئی؟"

کچھ دیر تک برجو خاموش رہا۔ اس نے نیا سگار جلایا۔ آہستہ آہستہ اس نے کئی کش لئے۔ پھر وہ بولا۔ گناہگار تو میں ہی ہوں۔ میں اسے وہ کچھ نہ دے سکا جسے وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ کوشش کرنے کے باوجود میں اس سے محبت نہ کر سکا۔

تو کیا، اسے لکشمی کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا؟"

"شادی کے سال بھر بعد معلوم ہو گیا تھا۔ اس وقت میری پوسٹنگ فرینٹر میں تھی۔ ایک رات میں کلب سے بہت شراب پی کر لوٹا تھا۔ جب میں اپنے بیڈ روم میں سونے کے لئے گیا تو چاندنی میں دیکھا کہ سفید کپڑے پہنے لکشمی میرے پلنگ پر لیٹی ہے۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بہت پیار کیا۔ اس نے کہا برجو تم رو رہے ہو؟ کیا ہوا؟ میں نے کہا۔ وعدہ کرو اب مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جاؤ گی۔ لکشمی لیکن وہ لکشمی نہیں تھی۔ اور اس رات کے بعد سے موہنا بھی وہ نہ رہی۔ کچھ اور ہی ہو گئی اس نے میرے ساتھ شراب پینا شروع کی۔ پھر دوسروں کے ساتھ۔ اس کے بعد جو ہوا وہ تم کو معلوم ہی ہے۔ مگر میں اب بھی اس کو دوش نہیں دیتا۔ اپنی تباہی اور اس کی تباہی دونوں کا ذمہ دار میں ہوں:

اور لکشمی؟"

اس کی زندگی بھی میری وجہ سے تباہ ہو گئی۔ جب میرا سہارا چھٹ گیا تو اسے اپنی ماں کے پاس جانا پڑا۔ وہ سب کرنا پڑا جس سے صرف میں اسے بچا سکتا تھا۔ بنارس سے دہلی کے چاوڑی بازار میں آئی۔ وہاں سے کلکتہ کے سونا گاچی میں۔ وہاں سے بمبئی کے فارس روڈ پر۔

اب سنا ہے کہ وہ بوڑھی اور بیمار، اس دھندے کے لئے بے کار ہو کر بنارس لوٹ گئی ہے

وہاں کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑی ہے اور..... اور.....؟

"اور؟" میں نے پوچھا۔

میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔

اس شام کو جب میں اسے چھوڑنے سٹیشن پر گیا اور ہم ٹکٹ خریدنے لگے تو بابو نے حسب معمول پوچھا "سنگل یا ریٹرن۔ تو برجو نے جلدی سے کہا "سنگل" اور پھر پلیٹ فارم پر پہنچ کر مجھ سے بولا۔ یہ میرا آخری سفر ہے۔ اس پر مجھے واپسی کے ٹکٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔

ٹرین روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک عجیب معجزہ دیکھا۔ وہ جھریوں دار چہرے اور کھچڑی بالوں والا بوڑھا اب بوڑھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے گال ایک عجیب مسرت اور جوش سے تمتما رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی چمک رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک کردار بن آگیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے وہ اپنا وہی پچیس برس والا برجو لگا۔

میں نے کہا: "برجو لکشمی بھابی کو میرا پرنام ضرور کہنا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم تمہارے رقیب نہیں ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ وہ نئے نویلے دولھا کی طرح شرما رہا ہے۔

عام کتابیں، اسکول کی کتابیں ہر قسم کے رسالے،
اسٹیشنری اور دیگر متعلق سامان کے لیے شہر کے عین وسط میں
ایک مشہور اور معیاری شاپ
ماہانہ بنیاد پر رسائل کی فراہمی
شفیق بک بنک اور سبسکرپشن ایجنسی
شمع روڈ ○ نیا مزنگ ○ لاہور

# اجنتا

"اجنتا ہندوستان کے آرٹ کی معراج ہے، دنیا میں اس کا جواب نہیں ہے ..... بڑے بڑے انگریز اور امریکن یہاں آکر دم بخود رہ جاتے ہیں ... ... یہ غار ڈیڑھ ہزار سال پرانے ہیں۔ ان کو کھودنے تراشنے، ان میں مجسمے اور تصویریں بنانے میں کم سے کم آٹھ سو برس کا عرصہ لگا ہوگا ... ... مہاتما بدھ کے اس مجسمے کو دیکھئے ... ..."

سرکاری گائیڈ کی منجھی ہوئی آواز غار کی اونچی پتھریلی چھت سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اٹھائیس روپے ماہوار تنخواہ اور روپیہ ڈیڑھ روپیہ روزانہ بخشیش، کے عوض وہ اپنا طوطے کی طرح رٹا ہوا سبق دن میں نہ جانے کتنی بار دہراتا تھا نرمل کو اس کی آواز ایسی معلوم ہوتی جیسے ریہٹ چل رہا ہو، یا چرخہ یا کولھو۔ روں، روں، روں، روں۔ ایک بے معنی، بے روح آواز کا لامتناہی سلسلہ جو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔

بھارتی ـــ جو آرٹ کی پرستار بھی تھی اور خود آرٹ کا ایک نادر نمونہ بھی ـــ گائیڈ کے الفاظ پر سر دھن رہی تھی۔ ہزاروں برس پرانے آرٹ کے اس اتھاہ سمندر میں وہ ڈوب جانا چاہتی تھی۔ ہر تصویر، ہر مجسمے، ہر ستون، ہر محراب، ہر پھول اور پتی کو دیکھ کر اس کے منہ سے تعریف کا چشمہ بے اختیار پھوٹ نکلتا تھا ـــ "اوہ نرمل یہ دیکھو ... ... اوہ نرمل وہ دیکھو ... ... مہاتما بدھ کے چہرے پر کتنا سکون اور شانت اکسپریشن ہے ... ... اس اپسرا کے بالوں کا سنگھار تو دیکھو ... ... ہاؤ سویٹ ... ... کتنا سندر ... ... ہاؤ ونڈرفل ... ..."

نرمل خاموش تھا۔ وہ نہ گائیڈ کی روں روں سن رہا تھا اور نہ بھارتی کے پرجوش تعریفی

چلے ... ... اس کی نگاہیں دیوار پر بنائی ہوئی تصویروں پر ضرور تھیں۔ مگر اسے سوائے دھندلے رنگین دھبوں کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا ... ... اس کے کان گائیڈ کی رٹی ہوئی تقریر کو سن رہے تھے، پر اب تک وہ صرف آواز تھی۔ بے معنی۔ دھما دھما شور۔ چرخے یا کولھو یا رہٹ کی روں روں کی طرح ... ... بھارتی جب بولتی تو نرمل کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں پر کوئی غیر متعلق اور قطعی غیر ضروری چوٹ پڑی ہے ... ... جیسے گرمی کی دوپہر میں تانبے کی طرح تپتا ہوا آسمان ایک اڑتی ہوئی چیل کی ہیبت ناک چیخ سے گونج اٹھے ... ...

نہ جانے وہ کس نمبر کے غار میں تھے۔ نہ جانے وہ کس تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے ... ...

گائیڈ کی روں روں جاری تھی ... ... یہ دیکھئے ایک پچھلے جنم میں سنیاسی کے روپ میں مہاتما بدھ اپدیش دے رہے ہیں۔ بنارس کے راجہ کی یہ نرتکی مہاتما بدھ کے اپدیش سنتی ہے ... ... راجہ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ خود جاکر سنیاسی سے سوال جواب کرتا ہے ... ... تم کون ہو اور کیا اپدیش دے رہے ہو ... ... وہ کہتے ہیں میں شانتی اور سچائی کا ذکر کر رہا ہوں ... ... راجہ اپنے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ وہ سنیاسی کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان تلوار سے کاٹ ڈالے۔ پر ہر بار مہاتما بدھ نے یہی کہا کہ شانتی اور سچائی تو میرے دل میں ہے۔ ناک، کان، ہاتھ، پاؤں میں نہیں ہے ... ... یہ دیکھئے ان کے زخموں سے خون ... ...،،

خون !،،

گائیڈ کی بے معنی، لامتناہی روں روں میں سے اس ایک الفاظ نے نرمل کے دماغ پر ہتوڑے کی طرح ایک چوٹ لگائی۔

خون !

اجنتا کے غاروں کی پتھریلی دیواریں یک لخت فضا میں تحلیل ہوگئیں ـــــ اب وہاں نہ مجسمے تھے، نہ تصویریں نہ ستون ـــــ نہ گائیڈ اور نہ بھارتی ـــــ نہ سرسبز پہاڑیاں، نہ وہ سریلے شور کے ساتھ بہنے والی ندی ـــــ نہ آرٹ اور نہ تاریخ ـــــ نہ دھرم اور نہ مذہب ـــــ نہ مہاتما بدھ اور نہ بنارس کا ظالم راجہ ... ...

خون !

خون کی ندیاں۔ خون کے دریا۔ خون کا سمندر۔ اور ان خونیں لہروں پر بہتا ہوا نرمل پھر بمبئی واپس پہنچ گیا۔ وہی خونی بمبئی جس سے بھاگ کر اس نے تین سو میل پرے اور ڈیڑھ ہزار برس پرانے غاروں میں پناہ لی تھی ... ...

یکم ستمبر ــــ شام کو حسب معمول وہ اپنا کام ختم کر کے گرگام اپنے دوست دسنت کے دفتر گیا تھا کہ دونوں ساتھ ہی ٹرین سے واپس جائیں گے کہ خبر آئی کہ شہر میں ہندو مسلم کا فساد ہو گیا ہے۔ کام چھوڑ کر ہر کوئی اس مضمون پر رائے زنی کرنے لگا۔

"تم دیکھنا یہ فساد چند گھنٹے میں دب جائے گا۔ اس بار گورنمنٹ نے پوری تیاریاں کر رکھی ہیں ... ..."

"پر آج کیسے ہو گیا؟ ــــ مسلم لیگ کا لے جھنڈوں کا مظاہرہ تو کل کرنیوالی ہے ... ..."

"یہ کلکتہ کی خبروں کا اثر ہے ..."

"سنا ہے کئی ہزار چھرے پکڑے گئے ہیں ..."

"سنا ہے گول پیٹھا پر پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویر کو ایک مسلمان پرانے جوتوں کا ہار پہنا رہا تھا ... ..."

"سنا ہے بھنڈی بازار میں مسلمانوں نے کئی ہندوؤں کو مار ڈالا ..."

"پر تم فکر نہ کرو، اب کے ہندو چپکے بیٹھنے والے نہیں ہیں ..."

اتنے میں امبولینس کار کی گھنٹی کی آواز آئی اور سب کھڑکی کی طرف بھاگے سامنے ہرکشن داس اسپتال کے دروازے میں زخمیوں کی موٹر داخل ہو رہی تھی۔ ایک گھٹے ہوئے جسم کے راہ گیر نے جو دھوتی اور میلی دھاری دار قمیص اور کالی مرہٹہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اسپتال کے دربان سے پوچھا۔

"یہ کون تھے؟ ہندو یا مسلمان؟"

دربان نے جو موٹر میں جھانک چکا تھا جواب دیا۔

"ایک مسلمان، دو ہندو"

اور فوراً کونے کے ہندو ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں کھسر پھسر شروع ہو گئی ساری چرنی روڈ پر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ہوٹل کے سب دروازے بند تھے۔ صرف بیچ والے لوہے کے جنگلے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ٹرام دیر ہوئی بند ہو چکی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ ہاں اوپر کی منزلوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب تناؤ تھا جیسے تنا ہوا ڈھول چوٹ پڑنے کا منتظر ہو۔

یکایک سینڈھرسٹ روڈ کے چوراہے کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہر شخص کی نگاہیں آواز کی سمت پھر گئیں۔ ایک دبلا سا نوجوان کرتا پاجامہ پہنے آ رہا تھا۔ بالکل بے فکر جیسے شہر میں فساد ہوا ہی نہیں تھا۔

"سالے کی ہمت تو دیکھو!" ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں سے ایک آدمی نے کہا اور گٹھے ہوئے جسم کے آدمی کا ہاتھ دھاری دار قمیض کے نیچے اپنی میلی دھوتی کی تہوں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگا۔

بے فکر دبلا نوجوان اب وسنت کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ اس کے ململ کے کرتے میں سے اس کی ہڈیاں نظر آ رہی ہیں۔ سانولا رنگ، چھوٹا سا قد، مگر اچھا ذہین چہرہ۔ کوئی کلرک یا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں نرمل کا جی چاہا، چلا کر کہے "میاں بھائی ذرا سنبھل کر آگے جانا۔ بڑا خراب وقت ہے۔" پر اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ اور چشم زدن میں اس نے ایک چمکیلی چھری کو ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔

چھری دستے تک دبلے پتلے نوجوان کی کمر میں اتر گئی۔ اس کے ہاتھ ایک بار بے اختیار اٹھے شاید بچاؤ کرنے کے لئے، مگر اگلے لمحے میں وہ چکرا کر گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے ایک کراہتی ہوئی آواز نکلی جو فریاد بھی تھی اور آخری ہچکی بھی۔

"ہائے بھگوان"

اور ہوٹل کے مجمع میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

"ارے یہ تو ہندو ہے ہندو"

"نہیں رے سالا بن رہا ہے"

"پاجامہ پہنے ہندو کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سالے کا پاجامہ کھول کر ختنہ دیکھو"

چھری ابھی تک نوجوان کی کمر میں گڑی ہوئی تھی، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کئی آدمیوں نے بڑھ کر سسکتی ہوئی لاش کو پلٹ دیا اور ایک نے کمربند کی ڈوری کو کھینچ کر گرہ کھولی۔

نرمل کی آنکھیں شرم سے بند ہو گئیں، اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غلاظت کے ڈھیر میں اس کا منہ رگڑ دیا ہو۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو قاتل لاش کو پھر الٹ کر زخم میں سے اپنی چھری باہر کھینچ رہا تھا۔

"یہ تو مسٹیک ہو گیا"

اس نے کہا۔ اور اپنی میلی دھوتی میں سے ایک کترن پھاڑ کر اس سے چھری کا خون پونچھنے لگا۔ چھری جب زخم سے باہر نکلی تو نرمل نے دیکھا کہ زخم سے سیاہی نائل گاڑھا گاڑھا خون بہہ نکلا اور مقتول نوجوان کے کپڑوں کو رنگتا ہوا سڑک پر پھیل گیا... ... ...

خون!

"خون خرابے" وہ ! دو دنگے سے دور یہ کتنی سندر اور شانت دنیا ہے نرمل؟"

بھارتی نے نرمی سے، پریم سے نرمل کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ ایک لہر نے اسے خونی سمندر کے باہر کنارے پر لا پھینکا۔

"کیا۔ کیا کہا تم نے بھارتی؟"

میں کہہ رہی تھی کہ اجنتا کے ان خاموش پرسکون غاروں میں ہم بمبئی کلکتے کے خون خرابے سے کتنی دور معلوم ہوتے ہیں۔ کئی ہزار برس دور، یہاں تم ضرور ان خوفناک نظاروں کو بھول سکو گے جو تم نے بمبئی میں دیکھے ہیں...."

بچاری بھارتی! حسین اور حسن پرست بھارتی؟ اس کا دل پریم سے کتنا بھرپور تھا اور اس کا دماغ سمجھ بوجھ سے کتنا خالی، اسے نرمل سے واقعی محبت تھی اور وہ اسے ایک منٹ کیلئے بھی دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جس دن فساد شروع ہوا اس سے اگلے دن ہی وہ جان گئی کہ نرمل کا نازک اور حساس دماغ اس خون خرابے کی تاب نہیں لا سکتا۔ چرنی روڈ کے خون کے بعد جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا نرمل نے تین دن کھانا نہ کھایا اور نہ ہی وہ سو سکا۔ اس کو چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ اس نے کسی کو اس کی وجہ نہ بتائی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا بھی تو اس نے ٹال دیا۔ پر، بھارتی سے وہ ہر بات کہہ دیتا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر نرمل نے اس خونیں واقعہ کی تمام ہولناک تفصیل اس کو سنا دی۔

"اس دبلے پتلے نوجوان کی صورت اب میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے، بھارتی اس کی آخری چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اس نے میری نیند اڑا دی ہے۔ رات کو سوتا بھی ہوں تو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک خون کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں، اور کوئی میری مدد کو نہیں آتا۔"

اور گھونگر والے بالوں میں اپنی ملائم انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوتے بھارتی نے کہا۔

"بیچارہ نرمل"

اپنی محبت، اپنی باتوں، سینما گراموفون، ریڈیو، کس کس طرح اس نے اپنے دوست کے دل سے اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ناکامیاب رہی۔ نرمل کی شگفتگی اس کی مشہور ظرافت، اس کی حاضر جوابی سرے سے غائب ہو گئی تھی۔ وہ جب کبھی بھی بھارتی سے ملنے آتا تو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا اور اس کی وحشت بھری آنکھیں ٹکٹکی باندھے فضا میں

وہ کہتی ۔ نہ جانے کیا دیکھتی رہتیں۔

۔ میں جانتی ہوں نرمل تمہارے حساس دماغ کو کتنا گہرا گھاؤ لگا ہے، مگر بھگوان کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو، اور اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کرو۔

وہ جواب دیتا

۔ ہاں بھول ہی جانا چاہئے، اور وہ سوچتا۔ کون کون سے واقعات بھلانے کی کوشش کروں؟"

نرمل کمار قدرت کی طرف سے ایک شاعرانہ دل اور دماغ لے کر آیا تھا۔ اس کی غزلیں اور نظمیں، مضامین، انشائیے لطیف اور افسانے ملک کے چوٹی کے رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ امیر باپ کی بیٹی بھارتی اس کی ادبی قابلیت کی قدر دان اور مداح تھی، اس کا بس چلتا تو نرمل کے لئے کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوبصورت بنگلہ بنوا دیتی، جہاں وہ سکون سے اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہتا۔ مگر وہ تو ایک روزنامہ اخبار میں رپورٹر تھا۔ بھارتی اکثر کہتی کہ اس جیسے ادیب کیلئے جرنلزم اختیار کرنا سراسر ظلم تھا۔

نرمل کہتا موجودہ ہندستان میں ادبی تخلیق صرف دماغی تعیش ہے اور لکھنے والے کے لئے اخبار نویسی ہی پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رپورٹر کی حیثیت سے وہ زندگی کے ڈرامائی عناصر سے دوچار رہتا۔ عدالت کے مقدموں، تھانے کوتوالی کی وارداتوں مزدوروں کی ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں میں اس کو انسانی سیرت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا اور یہی مشاہدات اس کے تخلیقی سانچے میں ڈھل کر ایسے مضامین، افسانے، اور نظمیں بن جاتے تھے جن میں زندگی کی سچائی زندگی کی تڑپ اور زندگی کی روح نظر آتی تھی۔

رپورٹر کی حیثیت سے نرمل کو فساد کے زمانے میں بھی سارے شہر میں گھومنا پڑتا تھا۔ سینڈھرسٹ روڈ، بھنڈی بازار، پائیدھونی، بائیکلہ، پریل، دادر، سارا شہر میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ ہر محاذ پر خون اور قتل کے واقعات ہو رہے تھے۔ یہاں ایک مسلمان ڈبل روٹی والا مارا گیا۔ وہاں ایک ہندو دودھ والے کو کسی مسلمان نے چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔ یہاں ایک پٹھان کا خون ہوا۔ وہاں ایک پوربی بھیا قتل ہوا۔ یہاں ایک دس برس کے بچے کو کسی نے ذبح کر دیا۔ وہاں ایک گیارہ برس کے بچے نے ایک راہ چلتے آدمی کی پسلیوں میں چاقو بھونک دیا۔

سارا شہر "ہندو بمبئی" اور "مسلمان بمبئی" میں منقسم ہو گیا۔ کسی ہندو کی جرأت نہ تھی کہ بھنڈی بازار میں قدم دھر سکے۔ کسی مسلمان کی ہمت نہ تھی کہ پائیدھونی سے گزر سکے۔ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان قائم ہو گئے تھے۔ نرمل اور دوسرے رپورٹروں کو اکثر پولس یا فوج کے ساتھ

لاریوں میں گشت کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن ایک گورے سارجنٹ نے نرمل سے کہا۔

"تم کانگرسی پاکستان نہیں چاہتے، پھر بھی اس وقت بمبئی میں پاکستان قائم ہے یا نہیں؟"

اگلے دن ایک انگریز ٹامی نے نرمل اور اس کے ساتھی رپورٹروں سے کہا۔

"تم لوگ تو کوئٹ انڈیا کا نعرہ لگاتے تھے نا؟ ہم سے کہتے تھے نکل جاؤ ہندوستان چھوڑ دو۔ اب ہم چھوڑنے کو تیار ہیں تو کیوں ہماری خوشامد کرتے ہیں کیوں ہمارے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو؟ ہماری حفاظت کا مطالبہ کرتے ہو؟ ہندو کہتے ہیں ہمیں مسلمانوں سے بچاؤ، مسلمان کہتے ہیں، ہمیں ہندوؤں سے بچاؤ، پر دونوں ہماری حفاظت، ہماری توپوں اور بندوقوں کے محتاج ہیں۔ دونوں کہتے ہیں DONT QUIT INDIA اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے ہندوستان کی آزادی کا محل اڑا اڑا دھم گر پڑا ہو۔ جیسے پچھلے سو برس کی تمام قومی روائتیں ایک لمحے میں مٹی میں مل گئی ہوں... ... ترک موالات اور تحریک خلافت، سودیشی اور بائیکاٹ، جلیان والا باغ کی قربانی، گاندھی جی اور علی برادران، بھگت سنگھ، ستیاگرہ اور سول نافرمانی ... ... تمام نعرے اور قومی گیت، ہندستان کا اتحاد اور ہندوستان کی عزت اور ابرد... ... آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوری ... ... ہر چیز مٹی میں مل گئی ہو۔

"مٹی میں مل کر بھی اس کندن کی چمک نہیں گئی" گائیڈ بک رہا تھا۔

"اجنتا، ہندستان کے آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوری کا لافانی شاہکار ہے" بھارتی کہہ رہی تھی۔

مگر نرمل کو اس اندھیرے غار میں بجلی کی پیلی پیلی روشنی کے گھیرے میں بھی سوائے پھیکے پھیکے رنگوں کے چند بے معنی دھبوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ نہ حسن نہ آرٹ، نہ معنی، نہ مقصد۔ بجائے احساس حسن کے اس کا دل ایک عمیق غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چلا اٹھتا۔

"یہ سب کیوں؟ ... ... یہ ہزاروں آدمیوں کی ہزاروں برس کی محنت۔ کیوں؟ اور کس لئے؟ ... ... یہ پہاڑ کی گود سے تراشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری ——— کیوں؟ اور کس لئے؟ ... ... بے کار ہیں یہ سب۔ یہ ساری محنت بے کار تھی۔ دنیا کے لاکھوں برس کے ارتقا میں ایک لغو اور مضحکہ خیز لمحہ ... ... بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے ... ... اجنتا سے ہندستان نے نہ کچھ سیکھا ہے اور نہ سیکھے گا۔ یہ غار دنیا سے اہلیت سے سچائی سے فرار کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اجنتا نہ صرف

بے کار ہے بلکہ ایک زبردست جھوٹ ہے۔ دھوکا ہے، فریب ہے ۔۔۔۔"
گائیڈ نرمل کے خوفناک خیالات کی رو سے بے خبر اپنی روں روں کئے جا رہا تھا۔
"یہ دیکھئے مہاتما بدھ گھوڑے پر چڑھے بازار میں سے گزر رہے ہیں ان کے چہرے پر کتنی شانتی ہے ــــــ اور دیکھئے یہ عورتیں اپنے اپنے گھروں پر سے ان کو کتنی معتقدانہ نگاہوں دیکھ رہی ہیں۔
اور بھارتی کہہ رہی تھی۔
"نرمل دیکھو، ان عورتوں کے چہرے پر کتنی حسین وجدانیت طاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت اور ان کی ممتا کو کچھ اجنتا کے آرٹسٹ ہی سمجھے ہیں ۔۔۔ ۔۔۔"
ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت، ان کی ممتا!
نرمل کا دل چاہا کہ قہقہہ مار کر اتنے زور سے ہنسے کہ غاروں کی پتھریلی دیواریں لرز اٹھیں، یہ چٹانیں تھرا جائیں، یہ غاروں کا سلسلہ اس کے نعرۂ حقارت سے گونج اٹھے۔
ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!
جھوٹ۔ سراسر جھوٹ۔ دھوکا۔ خود فریبی۔
نرمل نہ کمیونسٹ تھا اور نہ کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھتا۔ مگر ایک دن وہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں پارٹی سکریٹری پورن چندر جوشی کا بیان لینے گیا تھا کہ یکایک سڑک کی طرف سے کچھ شور کی آواز آئی اور سب کھڑکیوں کی طرف بھاگے۔ جھانک کر دیکھا تو ایک بوڑھا سفید داڑھی والا بوری مسلمان اپنے خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ اور ساتھ کے مکان کی بالکنی پر اور اس کی نچلی منزل کی دہلیز پر مرہٹہ عورتوں کا ایک گروہ کھڑا ہنس رہا تھا جیسے کوئی نہایت دلچسپ اور مزے دار تماشا ہو رہا ہو۔
ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!
ایک ریڈ کراس کی موٹر آئی۔ اور بوڑھے بوری مسلمان کی لاش کو اٹھا کر لے گئی۔ اور سامنے والے مکان میں سے ایک مرہٹہ عورت بالٹی ہاتھ میں لٹکائے نکلی اور جہاں بوڑھے کا خون گرا تھا وہاں نہایت اطمینان سے پانی بہا کر سڑک کو دھو گئی اور کئی روز نرمل کے کانوں میں اُن عورتوں کے قہقہے ایک خوفناک شور بن کر گونجتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس بوڑھے کی سفید داڑھی جو خود کے خون سے رنگین ہو گئی تھی، ایک بھیانک بگولہ بن کر پھڑپھڑاتی رہی۔ اور اسے ایسے معلوم ہوا کہ تمام ہندوستان کی عورتیں کسی ایسے خوفناک اور خونیں مذاق پر ہنس رہی ہیں

جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی مامتا!!!!

نرمل کے بہت سے دوست مسلمان تھے مگر فساد کے دنوں میں وہ ان کے محلوں میں نہیں جا سکتا تھا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی رپورٹر اور دوست حنیف کو سخت بخار اور سرسام ہو گیا ہے۔ نرمل سے نہ رہا گیا اور بھنڈی بازار پہنچ ہی گیا۔ جہاں ایک چال میں حنیف اکیلا رہتا تھا۔

کرافورڈ مارکیٹ پر سوائے نرمل کے تمام ہندو بس سے اتر گئے۔ وہ خود کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کی وضع قطع سے یہ ہرگز نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ سے بعض تو اسے پارسی ہی سمجھتے تھے مگر پھر بھی جوں جوں بس بمبئی کے "پاکستانی" علاقے میں جا رہی تھی اس کا دل خوف اور پریشانی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا ہٹا کٹا، غنڈہ نما، مسلمان نوجوان اس کے دل کی دھڑکن سن کر سمجھ جائے گا کہ وہ ہندو ہے اور اپنی جاکٹ میں سے چھرا نکال کر اس کی کمر میں گھونپ دے گا۔ اسی طرح جیسے چرنی روڈ پر اس دُبلے پتلے نوجوان کو ایک ہندو غنڈے نے "شٹیک" سے مار ڈالا تھا۔ اور دفعتاً نہ جانے کیوں اس کی کمر کی ریڑھ کی ہڈی کے پاس کھجلی سی محسوس ہونے لگی اور ایک خیالی چاقو کا تیز پھل اس کی پسلیوں میں پیوست ہوتا گیا۔

باٹلی والا اسپتال کے پاس وہ بس سے اتر کر پیڑی پڑی چلا تو اسے چاروں طرف سے قاتل ہی قاتل نظر آئے۔ وہ پھابڑی والا جو کیلے اور موسمبیاں بیچ رہا تھا نہ جانے وہ کس وقت اپنا کاری کانٹے کا چاقو ایک ہندو کی کمر میں پیوست کر دے۔ وہ خوفناک لال داڑی والا پٹھان تو ضرور ایک "کافر بچے" کی تلاش میں ہوگا۔ پشت سے پتھریلی سڑک پر کھٹ کھٹ قدم قریب آتے ہوئے سنائی دیتے۔ نرمل نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس برقعہ میں کوئی "غنڈہ" ہی چھپا ہوا ہو۔ اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا حنیف کی چال کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

حنیف سرسامی کیفیت میں بے ہوش پڑا تھا۔ نرمل کو اس کے پاس شام تک ٹھہرنا پڑا۔ جب حنیف کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی اور اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ اسی وقت ایک سیٹی ہی بھونپوں میں پکارتا ہوا وہاں سے گزرا کہ شام کے پانچ بجے سے کئی علاقوں میں چوبیس گھنٹوں کا کرفیو لگا دیا گیا ہے کوئی گھر سے نہ نکلے کیوں کہ گشتی فوجیوں کو سر راہ چلنے والوں پر گولی چلانے کے احکامات دیدیئے گئے ہیں۔ نرمل نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے میں دس منٹ تھے اتنی دیر میں اس کا شیواجی پارک پہنچنا ناممکن تھا۔ چار و ناچار اس نے رات حنیف کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

حنیف کا کمرہ کنارے پر تھا۔ ایک کھڑکی میں سے بڑی سڑک نظر آتی تھی، دوسری ایک گلی میں کھلتی تھی۔ سڑک پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ کوئی جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ ایک پوربی "دودھ والا بھیّا" جس کی لمبی چوٹی دور دور سے پکار کر کہتی ہے کہ "میں ہندو ہوں" کندھے پر بہنگی جس میں دودھ کی گڑویاں رکھی ہوئی ہیں۔ سراسیمہ نظروں سے ادھر اُدھر آگے پیچھے دیکھتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اور اس چرنی روڈ والے واقعہ کی طرح نرمل کا پھر بے اختیار جی چاہا کہ چلا کر "دودھ والے بھیّا" کو خطرے سے آگاہ کر دے۔ مگر اس بار پھر الفاظ اس کی زبان پر جم کر رہ گئے اور چشم زدن میں تین تگڑے تہمد بند جوانوں نے اس دُبلے پتلے کالے پوربی کو گھیر لیا۔

"کہاں جاتا ہے بے کافر کے بچے؟"

دودھ والے بھیّا کی گھگھی بندھ گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شاید اسے ان تینوں کی آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔ وہ واپس مڑا۔ اُدھر بھی غنیم کا ایک گروہ کھڑا ہوا اُسکی طرف قاتلانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ ایک ہرن کی طرح جو ہر طرف شکاریوں سے گھر گیا ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لئے مایوس آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دفعتاً وہ اس گلی کی طرف بھاگا۔ اور اس کے تعاقب میں پانچ شکاری کتے ــــ!

نرمل بھاگ کر گلی والی کھڑکی کی طرف گیا۔ مگر ابھی وہ ادھر پہنچ نہ پایا تھا کہ دودھ والے بھیّا کے خود اپنی بہنگی میں الجھ کر گرنے کی آواز آئی۔ پیتل کی گڑویاں ایک جھنکار کے ساتھ سڑک پر اوندھ گئیں اور ان کا دودھ ایک سفید نہر بن کر بہہ نکلا۔ جب نرمل نے کھڑکی میں سے دیکھا تو اس سفید دودھ میں پوربی کا سُرخ خون مل چکا تھا۔

"بھاگ کر جاتا تھا سالا"

اور پھر نرمل نے برابر کے کمرے سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سنی۔

"اری او گل بانو۔ دیکھ تو سہی۔ ایک کافر ہماری گلی میں مارا گیا ہے" ... جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ "اری او گل بانو! مبارک ہو، ہماری گلی والوں نے آج کتنی بہادری کا کام کیا ہے!" ...

... اور پھر تین چار جوان، ادھیڑ، بوڑھی عورتوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں۔

"اری اس کی چٹیا تو دیکھ"

"اچھا ہوا۔ یہ سب پوربیئے دودھ میں برابر کا پانی ملاتے ہیں۔ اب سزا ملی ہے"

"گرگام میں جو مسلمان مارے ہیں ہمارے آدمی بھی ان میں سے ایک ایک کا بدلہ لیں گے۔

اور پھر ان ہی میں سے کوئی عورت اندر گئی۔ اور گھر بھر کا کوڑا، ترکاری کے چھلکے، انڈوں کے خول، گوشت کے چھیچھڑے اور ہڈیاں گلی میں لوٹ دیا۔ عین وہاں جہاں مکھیوں نے پوربی بھیّا کے

دودھ اور خون پر بھن بھنانا شروع کر دیا تھا۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح! ان کی آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ماتا!!!!

سینڈھرسٹ روڈ والی عورتوں اور بھنڈی بازار والی عورتوں کے خونی قہقہے مل کر نرمل کے لاشعور پر ایک مہیب گونج بن کر چھائے ہوتے تھے۔ وہی گونج اسے اب تک اجنتا کے ان غاروں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ دھندلی پھیکی رنگ کی تصویروں میں اسے ہر دیوی ہر اپسرا، ہر راج نرتکی، ہر عورت کے چہرے پر ایک شیطانی خوشی اور اس کی آنکھوں میں ایک قاتلانہ چمک نظر آئی۔ اور نرمل کا دل ایک عمیق نفرت سے بھر گیا۔

"میں ہر عورت سے نفرت کرتا ہوں"۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "ہر عورت سے یہاں تک کہ بھالتی سے بھی ـــــ بھارتی ـــــ جو اس سے محبت کرتی تھی اور جس سے مدت سے وہ بھی محبت کرتا تھا بھارتی جو نرمل کو اور اس کی حساس طبیعت کو اپنی دولت کی پناہ میں رکھنا چاہتی تھی۔ جو بمبئی اور اس کے کشت وخوں کے ماحول سے نرمل کو تقریباً زبردستی بھگا کر اجنتا لے آئی تھی۔ محبت۔ نفرت نفرت۔ محبت۔ ہم بھائی بھائی ہیں۔ ہم عاشق و معشوق ہیں۔ ہم دوست اور ساتھی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے میں منسلک ہیں، مگر ہم ایک دوسرے نفرت کرتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کی کمر میں چھرا گھونپتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں ... ...

"دیکھئے۔ یہ لاشیں دیکھئے۔ سر الگ اور دھڑ الگ"

گائیڈ اپنی رُوں رُوں کئے جا رہا تھا۔ بولتے بولتے اس کو پسینہ آگیا تھا مگر اس کی آواز نہ تھکتی تھی ـــــ اور بھارتی ـــــ نازک، نفاست پسند، حساس نرم دل بھارتی ـــــ غار کی دیوار پر تصویر ہی میں لاشیں دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔

"اس ظالم راجہ نے سب کو قتل کرا دیا ہے سر کٹوا کر لاشیں اس گڈھے میں پھنکوا دی ہیں چیلوں، گدھوں کے کھانے کے لئے ... ..."

اور نرمل کے دماغ میں یہ غیر متعلق خیال رینگتا ہوا چلا آیا کہ دراصل راجہ ظالم نہیں تھا بلکہ شاید اسے گدھوں، چیلوں کا بڑا خیال تھا۔ ان کو خوراک بہم پہنچانے کے لئے اس نے ان سب لوگوں کو مروا کر ان کی لاشیں یہاں ڈلوائی تھیں۔ اس کے ظلم میں کم سے کم مردار خور جانوروں کا تو بھلا تھا ... ...

لاشیں! ... ...

ستاتیس ٹھنڈی، مسخ شدہ کالی اور نیلی لاشیں، جو ٹھنڈے پتھر کے فرش پر اس طرح بکھری

ہوئی پڑی تھیں۔ جیسے فصل کٹنے کے وقت کسی کسان نے گیہوں کی بالیں کاٹ کر کھیت میں چھوڑ دی ہوں ... ...جیسے مذبح خانے میں ستائیس بکروں کی کھال اتار کر ایک قطار میں لگا رکھا ہو.... جیسے ... ...جیسے ستائیس انسانی لاشیں بکھری ہوئی ہوں!

نرمل اخبار کے لئے رپورٹ لینے اسپتال گیا تھا اور وہاں اسے پتہ چل گیا کہ کس کمرے میں فساد کے مقتولین کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور کورونر کے فیصلے کے لئے رکھی گئی ہیں۔ اس نے عمر بھر میں صرف ایک بار ایک لاش میڈیکل کالج کے سرجری وارڈ میں رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ تب بھی تین وقت اس سے کھانا نہ کھایا گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی مردہ آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہی تھیں مگر یہاں ایک لاش نہیں ستائیس لاشیں رکھی تھیں۔ بوڑھے۔ جوان۔ بچے۔ سوکھے ہوئے جسم۔ کسی کی کمر میں گھاؤ۔ کسی کی آنتیں پیٹ سے باہر نکلی ہوئی۔ کسی کی گردن سے سر جدا۔ دھڑ کے قریب رکھا ہوا کسی کا بھیجا پھٹے ہوئے سر میں سے باہر ابلتا ہوا۔ ان میں سے کون ہندو تھا؟ اور کون مسلمان؟ موت کی برادری میں سب ایک تھے۔ قاتل کی چھری نے سب کو برابر برابر بانٹ دیا تھا۔ یہ ٹھنڈا پتھریلا فرش۔ یہ تھا ان کا پاکستان اور ان کا ہندوستان۔ یہ بیکار موت۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ یہ سناٹا۔ یہ بے چارگی ——— یہ تھی ان کی آزادی۔ یہ تھا ان کا اسلام اور یہ تھا ان کا ویدک دھرم ——— جے جے مہادیو ——— اللہ اکبر!

نرمل عملی سیاست سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ علاوہ اخبار کے کام کے جو وہ پیٹ کی خاطر کرتا تھا وہ عمل کے میدان کا دھنی نہیں تھا۔ اس کی دنیا خیالات اور محسوسات کی دنیا تھی۔ پھر بھی فسادات شروع ہونے کے تیسرے دن ہی وہ اپنے محلے کے شانتی دل میں شامل ہو گیا تھا اور شاید اس لئے کہ اس کا تعلق ایک اہم روزانہ اخبار سے تھا۔ اور شانتی دل ہو یا سیوا سماج ہو یا خدام وطن؛ ہر پبلک جماعت کو پبلسٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو کمیٹی کا ممبر بھی چن لیا گیا تھا نرمل کا دوست اور ہمسایہ احمد جو ایک دوسرے اخبار میں سب اڈیٹر تھا۔ وہ بھی کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا تھا۔ اس لئے کہ تمام شیواجی پارک کے علاقے میں وہی صرف اکیلا مسلمان تھا جو شانتی دل میں شامل ہوا تھا اور ایسی کمیٹیاں سرکاری منظوری نہیں حاصل کر سکتیں جب تک ان میں سب فرقوں کے نمائندے موجود نہ ہوں۔

چند روز تک نرمل شانتی دل کی تنظیم کے کام میں مستغرق رہا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ فساد کے اثر سے اس پر جو ایک مہلک جمود اور گھٹے گھٹے غم اور بے بسی کی حالت طاری ہو گئی تھی وہ اب جاتی رہے گی۔ شانتی دل میں شامل ہو کر اس کو وہی وجد آفریں مسرت حاصل ہوئی جو ایک سپاہی کو طبل جنگ سن کر ہوتی ہے۔ یہ جنگ تاریکی اور روشنی کے درمیان تھی۔ غارتگری

اور امن کے درمیان۔ وہ اس جنگ میں ایک سپاہی تھا۔ وہ شیطانی تعصبات اور درندگی کے خلاف جہاد میں شریک تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس جنگ میں کوئی کارہائے نمایاں نہ کر سکے مگر کم سے کم اس کو یہ تسلی تو تھی کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے، کہ اس کی زندگی بالکل بے کار، بے معنی اور بے مقصد تو نہیں ہو گئی ہے۔

بھارتی نے کئی بار نرمل سے کہا۔

"چلو بمبئی سے باہر کہیں چلے چلیں۔ جب فساد ختم ہو جائے گا۔ تب آ جائیں گے۔

آگرہ، دہلی، کشمیر، اجنتا، ایلورہ، میسور، سیلون نہ جانے کہاں کہاں جانے کا لالچ دلایا۔ مگر نرمل کو ایسے وقت بمبئی چھوڑ کر باہر جانا پرلے درجے کی کم ہمتی اور بزدلی معلوم ہوئی۔ بھارتی نے لاکھ سمجھایا کہ اس جیسے حساس آرٹسٹ کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا، اس کی خداداد ذہانت کی تحقیر تھی۔ مگر وہ نہ مانا۔ اور سوائے دفتر کے اوقات کے سارے دن اور رات کا بیشتر حصہ شانتی دل کے کام میں صرف کرتا رہا۔

شانتی دل کا کام؟ نرمل سمجھا تھا کہ اس کا کام واقعی شانتی کا پرچار ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ شانتی دل کے ممبر گھر گھر جائیں گے اور لوگوں کو امن اور شانتی سے رہنے کی تلقین کریں گے آپس کی فرقہ دارانہ منافرت کو دور کر کے یگانگت اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

شہر میں خود ان کے علاقے میں ہر دم ہر قسم کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ماہم کے مسلمان شیواجی پارک کے ہندوؤں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ شیواجی پارک کے ہندو ماہم کے مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ہندو دودھ والے دودھ میں زہر ملا کر مسلمانوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں، مسلمان نرکاری والے بینگنوں اور موسمبیوں میں زہر کے انجکشن دے کر ہندوؤں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ ایرانی ہوٹلوں کی چائے مت پیو، اس میں زہر ہے۔ ہندو حلوائی کی مٹھائی مت کھاؤ۔ اس میں زہر ہے جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ، اور تعصب اور نفرت کا ایک طوفان جس میں تمام شہر ڈوبا جا رہا تھا۔ نرمل اور اس کے دوست احمد کو امید تھی کہ شانتی دل کا پہلا کام ہوگا اس خونی سیلاب کو روکنا۔ مگر جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

شانتی دل کا پہلا کام۔ چندہ جمع کرنا... ... احمد کے ساتھ نرمل ہر کسی کے ہاں گیا۔ گنتی کے جو چند مسلمان تھے انھوں نے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یہ شانتی دل کے پردے میں ہندو کیا کر رہے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں... ...ہم نے بھی اپنی حفاظت کے لئے پٹھان رکھ لئے ہیں...،،

بعض ہندوؤں نے کہا۔

"آپ کے نہتے والینٹر ہماری حفاظت کیا خاک کر سکتے ہیں؟ ہم سکھ دربان رکھ رہے ہیں۔ اور پھر راز دارانہ لہجے میں۔" سکھ کرپان رکھ سکتے ہیں، کیا سمجھے"

خیر۔ چندہ جمع کیا گیا۔ بیس پہرے دار پچاس پچاس روپے ماہوار پر ملازم رکھے گئے۔ کمیٹی میں مسئلہ درپیش ہوا کہ ان کو کہاں کہاں ڈیوٹی پر لگایا جائے"

"ایک ایک آدمی ہر سڑک کے ناکے پر لگایا جائے۔"

"نہیں۔ یہ حماقت ہوگی۔ حملہ صرف تین طرف سے ہو سکتا ہے، یا ماہم کی طرف سے، یا ورلی کی طرف سے یا سمندر کی طرف سے، صرف ان ناکوں پر پہرہ لگانا چاہئے۔"

"حملہ؟۔ کس کا حملہ"

"مسلمان اگر حملہ کریں گے تو اور کدھر سے حملہ کریں گے؟"

"پر ان پہرے داروں کا کام کیا ہوگا؟"

"ان سے کہہ دیا جائے کہ جیسے ہی کسی مسلمان غنڈے کو دیکھیں سیٹی بجا دیں تاکہ چاروں طرف سے لوگ جمع ہو جائیں

"صرف مسلمان غنڈے؟ اور اگر ہندو غنڈے ہوں تو؟"

نرمل نے یہ سوال کیا تو، مگر وہ احمد سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔

کمیٹی کے جلسے کے بعد اس نے احمد سے کہا۔

"یہ تمھاری ہی ہمت ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کام کر سکتے ہو مجھے تو یہ سب مہا بھائی معلوم ہوتے ہیں۔

احمد نے کہا۔

"ایسے بیوقوفوں اور جاہلوں کی کمی دونوں طرف نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ماہم کے مسلمانوں میں کیا کیا افواہیں مشہور کی جا رہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیواجی پارک میں شانتی دل کے نام سے ہندوؤں کی ایک فوج تیار کی جا رہی ہے۔ جو بہت جلد ماہم کے مسلمانوں پر شب خون مارے گی۔"

چندہ۔ والینٹر۔ محافظ۔ وردیاں۔ سیٹیاں۔ جلسے۔ رزولیوشن۔ پولس کمشنر کے نام عرضیاں۔ مگر شانتی کا پرچار؟ اتحاد کا پروپیگنڈہ؟ ان کا نام نہیں تو پھر شانتی دل کا مقصد؟ اس دوڑ دھوپ سے فائدہ؟ مسلمان غنڈے ـــــ ہندو غنڈے ـــــ گھروں میں پتھر جمع کر کے رکھو، میں نے تو دس لاٹھیاں چھپا رکھی ہیں۔ میرے ہمسائے کے پاس پستول ہے۔

شانتی! شانتی!! شانتی!!!

"یہ شانتی کا مہاساگر ہے، نرمل"۔ بھارتی کہہ رہی تھی "اگر ہم آٹھ دس دن تک روز یہاں آکر کئی گھنٹے گزارا کریں تو مجھے یقین ہے کہ تمھارے بے چین دل کو ضرور شانتی ملے گی۔"

اور گائیڈ کہہ رہا تھا۔

"آپ نے سب غار دیکھ لئے ہیں۔ اب ایک باقی رہ گیا ہے۔ مگر اس میں آپ کو دوسرے غاروں کی طرح سنگتراشی اور مصوری کے نادر اور حسین نمونے نہیں ملیں گے۔ چھت، ستون، فرش، ہر چیز نامکمل ہے۔ اس غار کا کام ادھورا رہ گیا ہے ... ..."

"ادھورا کام! وہ ——— نرمل ——— بھی تو بمبئی میں اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ بلکہ ادھورے سے بھی کم ——— ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے ہار مان لی تھی۔

شانتی دل کمیٹی کا آخری جلسہ۔

نرمل نے شروع ہی سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بجائے معمولی ان پڑھ اور اجڈ دربانوں اور چوکیداروں کے آزاد ہند فوج کے سابق سپاہیوں کو معقول مشاہرے پر حفاظت کے لئے رکھا جائے کیونکہ وہ فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک اور بالا تھے۔ ان میں قومی خدمت کا جذبہ تھا اور وہ اپنی پرانی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے مدد کے مستحق تھے شانتی دل کے سکریٹری نے اس جلسے میں بیان کیا کہ پرانے تمام پہرے دار علیحدہ کر دیئے گئے ہیں اور ان کی بجائے چودہ آزاد ہند فوج کے سابق سپاہی رکھ لئے گئے ہیں۔ یہ سن کر نرمل کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اب شانتی دل کا کام صحیح طریقے پر ہو گا۔ مگر ایک لمحے ہی میں اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

ایک بوڑھے مرہٹہ وکیل نے سوال کیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آزاد ہند فوج کے ان سپاہیوں میں مسلمان بھی ہیں؟"

سکریٹری نے کہا۔

"ہاں، مگر صرف ایک"

ایک موٹے گجراتی سیٹھ نے کہا۔

"میرے حلقے میں اس بات پر بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔"

ایک دُبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

"یہ تو عجب کی بات ہے"

بوڑھے وکیل نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں سکریٹری صاحب سے اس معاملہ میں جواب طلب کرتا ہوں کہ کیوں ایک مسلمان کو رکھا گیا"

گجراتی سیٹھ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"اگر ایسا ہوگا تو ہم لوگ ایک پیسہ چندہ نہیں دیں گے"

ایک پستہ قد ڈاکٹر نے کہا۔

"میرے حلقے کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ... "

دُبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

"یہ ہماری استریوں کی عزت کا سوال ہے"

بوڑھے وکیل نے کہا۔

"میں جواب طلب کرتا ہوں ... ..."

پریسیڈنٹ نے کہا۔

"خاموش۔ خاموش"

سکریٹری نے کہا۔

میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آزاد ہند فوج میں ہندو مسلمان کی تفریق نہیں کی جاتی۔ لیکن اگر کمیٹی کی رائے یہی ہے تو ہم کسی بہانے سے اس مسلمان سپاہی کو علیحدہ کر سکتے ہیں"

سب نے بیک وقت شور مچایا۔

"ہاں ہاں"۔ "فوراً"، "ایک دم"۔ اس کو رکھا ہی کیوں؟"۔ صرف احمد خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

نہ جانے کیوں احمد کو اطمینان سے مسکراتے دیکھ کر نرمل کے صبر کا پیمانہ دفعتاً لبریز ہوگیا اس کے دماغ کے اندر کی کوئی کل دفعتاً تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

"نہیں! نہیں!!"۔ وہ غیر معمولی جوش سے چلایا۔ سکریٹری جو جلسے کی روئداد میں یہ الفاظ لکھنے میں مصروف تھا کہ "یہ تجویز بلا مخالفت پاس کی گئی کہ آزاد ہند فوج کے جن سابق سپاہیوں کو حفاظت کے لئے رکھا جاتے، ان میں کوئی مسلمان نہ ہو ... ..." اپنی کرسی سے تقریباً اچھل پڑا اس کے ہاتھ سے قلم گر پڑا اور سفید کاغذ پر جہاں اس تجویز کے الفاظ لکھے گئے تھے وہاں روشنائی کا ایک بڑا دھبہ پڑ گیا... ..."

"نہیں! نہیں!! نہیں!!! جیسے اس ایک لفظ کے دس بار دہرانے سے باقی دس

ممبروں کی رائے منسوخ ہو جائے گی، میں ایسی تجویز کی کبھی کسی حالت میں بھی موافقت نہیں کر سکتا"۔

نرمل کے الفاظ کی والہانہ شدت نے چند لمحوں کے لئے سب کو خاموش کر دیا۔ مگر اس خاموشی میں اسے اپنی آواز کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہوئی۔ ایسی تجویز ہمارے لئے باعث شرم ہوگی۔ ہم شانتی اور اتحاد کے نام لیوا ہیں۔ مگر ہم خود بدترین فرقہ وارانہ تعصب کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اگر یہ تجویز پاس ہوئی تو میں اس معاملہ کو پریس اور پبلک کے سامنے رکھنا اپنا فرض سمجھوں گا۔

اور احمد مسکرائے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"شاباش، بچے۔ مگر یہ سب بے کار ہے"

دُبلے مارواڑی نے مخالف کی حیثیت سے کہنا شروع کیا۔

مسٹر نرمل کو نہیں معلوم کہ ہم ہندو کتنے کھترے میں ہیں ... ..."

گجراتی سیٹھ نے کہا۔

"ہم تو صاف بولیں گے۔ اگر مسلمان رہے گا تو ہم چندہ نہیں دیں گے"

پستہ قد سیٹھ نے کہا۔

"ہم استعفیٰ دے کر ہندو مہا سبھا کے شور کھشن دَل میں مِل جائیں گے۔

مگر چالاک بوڑھے وکیل نے دوسروں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرتے ہوتے نرمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مسٹر نرمل ایک بات بتایئے، یہ ہندو علاقہ ہے۔ اگر یہاں پہرہ دیتے ہوتے اس بیچارے مسلمان سپاہی کو کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو کون ذمہ دار ہوگا؟ آپ" اور یہ کہہ کر اس نے گجراتی سیٹھ اور پستہ قد ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ گویا کہہ رہا ہو کہ دیکھا میرا قانونی پینترا ایسے ایسے لونڈے میں نے بہت دیکھے ہیں ..."

احمد نے مسکرا کر نرمل کی طرف دیکھا اور نظروں میں کہا۔

"میں نے کہا نہیں تھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے ... ..."

تجویز پاس ہوگئی۔ نرمل بھرا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ دعوے دلائل۔ منطق۔ سیاست۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس تعصب اور جہالت کی دیوار پر سر پٹخنا لاحاصل ہے۔ اس کے چاروں طرف آوازوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ تجویزیں پاس ہوتی رہیں۔ بحث مباحثے ہوتے رہے۔ حسب معمول مختلف ممبروں اور عہدے داروں میں سخت کلامی

بھی ہوتی رہی۔ مگر نرمل نے نہ کچھ کہا نہ سنا۔

اس کا دماغ خوفناک خیالات اور مناظر کا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ احمد آباد۔ نواکھالی۔ بہار۔ قتل۔ خون۔ خون کی ندیاں۔ خون کے دریا۔ خون کا سمندر۔ نفرت اور تشدد۔ تعصب اور نفرت۔ عورتوں کی بے حرمتی۔ بچوں کی لاشیں۔ لاشوں کے پہاڑ۔ ایک خونین آسمان کی طرف لپکتے ہوئے ہزاروں شعلے... ...اور ایک کلدار ہتوڑے کی طرح یہ خیال اس کے دماغ پر چوٹ لگاتا رہا کہ یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ شیواجی پارک شانتی دل کے ممبر آزاد ہند فوج کے ایک مسلمان سپاہی کو اپنی حفاظت کے لئے رکھنے کو تیار نہیں ہیں... ...

اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ آزاد ہند فوج کے شاندار تاریخی کارنامے بے کار تھے۔ تمام جنگ آزادی بے کار تھی۔ تمام دیش بھگتوں اور شہیدانِ وطن کی قربانیاں بے کار تھیں تمام قومی نعرے، تمام قومی تحریکیں، تمام قومی لیڈر، ہر شخص بے کار تھا۔ ہر چیز بے کار تھی۔ شیواجی پارک شانتی دل بے کار تھا۔ اس سلسلے میں نرمل کا کام بے کار تھا۔ اس کا بمبئی میں رہنا بے کار تھا۔ اس کی زندگی ہی بے کار تھی ...اس لئے کہ ہندو اور مسلمان کے ٹھپّے آزادی اور ہندوستان سے زیادہ اہم ثابت ہوتے تھے۔

اسے شانتی دل کمیٹی کے وہ سب ممبر اس وقت تعصب اور نفرت اور خطرناک جہالت کے دیوتا معلوم ہوئے جو اپنی آتشیں آنکھوں سے اس کو گھور رہے تھے۔ جو اسے بھسم کر لینے کے لئے اس کی طرف بڑھے آ رہے تھے وہی دس نہیں، بلکہ ہر طرف سے لاکھوں راکھشسوں کے دل کے دل اس کی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ ان میں چوٹی والے بھی تھے اور داڑھی والے بھی۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی، بنگالی، بہاری، مرہٹہ، گجراتی، پنجابی، پوربی پٹھان اور سب اس کے خون کے پیاسے۔

"بھاگ"

نرمل کے دھڑکتے ہوئے دل نے اسے للکارا

"بھاگ"

اور نرمل نہ صرف جلسے کے ختم ہونے سے پہلے ہی شانتی دل کے دفتر سے بھاگا بلکہ دن بھارتی کے ساتھ بمبئی سے بھی بھاگ آیا۔

"کہاں چلیں؟" بھارتی نے پوچھا۔

"جہاں یہ قتل و خون نہ ہو، جہاں اخبار نہ ہو، ریڈیو نہ ہو، جہاں ہندو نہ ہوں۔ مسلمان نہ ہوں، جہاں چاقو، چھریاں، برچھے، بھالے، تیزاب، غنڈے، موالی نہ ہوں۔

دور ——— دنیا اور زندگی سے دور ———!"

اور بھارتی نے سوچ کر کہا۔

"اجنتا؟"

احمد نرمل کو چھوڑنے اسٹیشن پر آیا۔ گاڑی چلنے لگی تو اس نے کہا۔

"اچھا ہے، چند روز کے لئے تبدیل آب و ہوا کر آؤ۔ مگر اگلے اتوار کو شانتی دل کا جلسہ ہے جس میں چند تجویزیں پیش کرنے والا ہوں، اس میں تمھاری موجودگی ضروری ہے"

اور جب نرمل نے کہا۔

"میں اب شانتی دل کے جلسے میں کبھی نہ جاؤں گا"

تو احمد نے چلتی ریل کے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا تھا۔

"تم اس کام کو ادھورا چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے، نرمل"

"ادھورا کام!"

ہنہ۔ یہ اجنتا کے سنگ تراش اور مصور۔ یہ بھی تو اس آخری غار کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں۔ کیا واقعہ پیش آیا کہ آٹھ نو برس تک درجنوں نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد اس غار کو وہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟"

تمھارا کیا خیال ہے، بھارتی ..."

پر بھارتی وہاں نہیں تھی۔ نہ گائیڈ تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ نرمل کی آواز غار کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی، غلام گردش میں گھوم کر پھر واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا۔ اور بھارتی اور گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے کہ ممکن ہے وہ تنگ آ کر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہو گا کیوں کہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی ہے وہ کالی پڑ چکی تھی، شاید آفتاب غروب ہو چکا تھا... ایک بڑھتی ہوئی گھٹن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لئے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لئے آ رہا تھا وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اسے ڈھونڈتے ہوئے غار کے کسی دوسرے اندھیرے کونے میں چلا گیا ہو، اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے جو

آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوتے آیا تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کے کسی جھول میں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے منڈے ہوتے سر کے درجنوں بھکشو مشعلیں لئے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آرہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنی اپنی چھینیاں اور ہتوڑے نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے یا ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہو گئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کر کے اس کی سطح ہموار بنا رہے تھے تاکہ جب دیوار اکھڑ جائے تو مصور اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں۔ اور غار پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تو نرمل اس پُرحیرت منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس سے نہ رہا گیا اور وہ اس سنگ تراش بھکشو کے پاس گیا جو سب سے پہلے غار میں داخل ہوا تھا۔

معاف کیجئے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں، مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہی ہے۔ اور یہ ادھورا ہی رہے گا"

"دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے، انسان بھی ادھورا ہے۔ نگران کی تکمیل ہونی چاہئے"

اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا

"آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"نو سو برس سے"

"نو سو برس؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر..... "

"میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل۔ آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔

"آپ کا نام؟" نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

"میرا نام؟ کچھ نہیں۔ ہم سب بے نام ہیں"

اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصور کا نام کھدا

ہُوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"پھر آپ کس لئے اتنا کام کرتے ہیں؟"

"کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا۔ انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے۔"

"تو یہ کام کب ختم ہوگا"؟

"کون جانتا ہے؟"

"اس غار کو ... ..."

"پورا ہونے میں دو سو برس لگیں گے۔ اس کے بعد دوسرا غار، اور اس کے بعد تیسرا..."

"تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہوگی؟"

"ہوگی ـــ جب انسان کی تکمیل ہوگی"

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آئی، اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

"مہربانی کر کے مجھے سمجھائیے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لئے؟ یہ پہاڑ کی گود سے ترشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری؟ یہ کیوں اور کس لئے؟"

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصہ آتا گیا۔

"بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے۔ آپ لوگوں نے سنگتراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لئے بناتے ہیں۔ یہ غار دنیا سے، اصلیت سے سچائی سے فرار سکھانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

سنگتراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پُرسکون مسکراہٹ تھی۔ جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا، صرف محبت اور رحم اور عمیق ادراک۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹاتے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا۔

"نہیں"

نرمل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اُس کے صبر و سکون پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے چلا کر کہا۔

"تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟"

"سنو"۔ اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی صرف پتھر پر لوہا پڑنے کی آواز۔

نرمل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ، اجنتا کا پیغام سنائے گا، مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ صرف اس کی چھینی کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ اور پتھر کے پتلے پتلے پترے چھل کر فرش

پر گرتے رہے۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام ... ؟" مگر دفعتاً نرمل کے اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن چمکی، اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا۔

غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ یہی تھا اجنتا کا پیغام، جسے وہ بھکشو نرمل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرمل کی آنکھوں میں سمجھ کی نئی چمک دیکھ کر وہ راہب اپنی معصوم ادا سے مسکرایا، اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آبِ حیات۔ اکسیر۔ اس قیمتی نسخے کے سامنے ہر چیز ہیچ تھی۔ اُسے اجنتا کا پیغام مل گیا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ اس غار کے کونے میں بیٹھا ہوا پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں کو سنتا رہا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

اور ہر بار جب لوہے کی چھینی پتھر کی دیوار پر پڑتی تھی، نرمل کو معلوم ہوتا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

عمل! عمل!! عمل!!! کام! کام!! کام!!! محنت! محنت!! محنت!!!

عمل سے پتھر موم کی طرح پھیلا جاتا ہے۔ عمل سے پہاڑ کی چٹانیں کاٹی جاتی ہیں۔ عمل سے پتھر میں گلکاری کی جاتی ہے۔ عمل سے تصویروں میں زندگی کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ عمل سے انسان انسان بنتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے۔ عمل خود عمل کا انعام ہے ... ...

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، یہ پتھر ضرور پھپل کر، ترش کر سنگ تراشی اور مصوری کے نادر نمونے بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کی منزل کمالِ فن ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، انسان کی فطرت کے پتھر پھپل کر، ترش کر، حسن اور خوبصورتی، فن اور علم کے نادر نمونے ضرور بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں لاکھوں، کروڑوں، تمام انسان مل کر ان کو

تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام جاری رکھیں گی۔ اس کی منزل تکمیل انسانیت ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ نرمل نے دیکھا کہ راہب اپنے کام میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہتھوڑے کی چوٹ اس کے انگوٹھے پر پڑی۔ زخم سے لال لال لہو کی بوندیں ٹپک کر پتھریلی فرش پر گر رہی تھیں۔

اور دفعتاً نرمل کو وہ تمام تصویریں یاد آگئیں جو اس نے ان تمام غاروں میں دیکھی تھیں ہزاروں برس کے بعد بھی کتنے تازہ، کتنے شاداب تھے ان کے رنگ۔ اور نہ جانے کیوں نرمل نے سوچا۔ کہ ان تصویروں کی لالی میں انسان کے خون کا رنگ ہے۔ جبھی تو وہ اتنے جیتی جاگتی ہیں۔ جبھی ان میں اتنی زندگی ہے ... ...

شاید وہ سو گیا۔ شاید وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا، تو غار طلوع آفتاب کی دھیمی دھیمی ترچھی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ نہ وہ سنگ تراش تھے۔ نہ مصور۔ نہ مشعلیں۔

تو کیا اس نے خواب دیکھا تھا؟ ... ... شاید ... ... کتنا عجیب خواب!

اس نے سوچا

۔ہاں۔ خواب ہی ہوگا۔ رات بھر اس ماحول میں گزار کر کوئی تعجب نہیں کہ میرے تخیل نے ایک کیفیت پیدا کر دی ہو۔"

مگر باہر جاتے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گزرا جس کو اس کے خواب والا راہب تراش رہا تھا، تو اس نے دیکھا کہ ستون پر ایک پھول کھدا ہوا ہے جو کل نہیں تھا۔ یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آ کر اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرمل بھارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اگلے دن اتوار تھا، اور اسے شانتی دل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لئے پہنچنا ضروری تھا۔ بمبئی سے، فسادے، زندگی سے، کوئی فرار نہیں تھا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا۔

"آپ شاید اجنتا ہو کر آ رہے ہیں؟"

اور نرمل نے جواب دیا۔

"جی نہیں۔ میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں!"

# بھولی

اس کا نام تو سلیکھا تھا مگر بچپن ہی سے اس کے گھر والے ہی نہیں سارے گاؤں والے اسے بھولی کہتے تھے۔ ان کے پڑوس کے رہنے والوں کا کہنا تھا کہ نمبردار رام لال کی چوتھی بیٹی سلیکھا جب دس مہینے کی تھی تو گھاٹ پر سے سر کے بل گر پڑی تھی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ زمین کچی مٹی کی تھی اس لئے ننھی جان تو بچ گئی، مگر بھیجے کی کوئی نازک رگ شدید بچک گئی۔ اس کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس کی عقل کم ہی رہی۔

مگر برادری کی بڑی بوڑھیوں کا کچھ اور ہی کہنا تھا۔ نمبردار کی چوتھی بیٹی جب پیدا ہوئی تو اتنی خوبصورت تھی کہ بالکل میم کی بچی معلوم ہوتی تھی۔ گوری چٹی لال لال بھولے بھولے گال — ریشمی کالے بال اور بڑی بڑی آنکھیں جو کاجل لگانے سے اور بھی بڑی بڑی لگتی تھیں۔ سارے گاؤں میں شاید ہی کوئی ہوگا جو اسے دیکھنے نہیں آیا۔ بس ان ہی آنے جانے والوں میں سے کسی ہونسنے والے کی نظر لگ گئی۔ ابھی دو سال کی نہیں ہوئی تھی کہ چیچک نکل آئی۔ وہ تو اللہ کا کرم ہوا کہ آنکھیں بچ گئیں۔ مگر سارے منہ اور بدن پر ہمیشہ کے لئے یہ چیچک کے کالے کالے داغ پڑ گئے اور بخار کی گرمی سے بھیجا کمزور ہو گیا اور زبان ہکلانے لگی۔

کسی کا کہنا یہ بھی تھا کہ سارا قصور اصل میں لاڈو دائی کا تھا۔ اس کے ہاتھوں گاؤں کا ہر بچہ جنم لیتا تھا۔ پیدا ہوتے بچے کی نال وہی کاٹتی تھی۔ وہی نہلاتی دھلاتی تھی اور وہی بچے کے منہ میں انگلی ڈال کر گلے کے سوراخ کو بڑا کرتی تھی۔ جب ہی تو لاڈو کے ہاتھوں پیدا ہونے سے بچے اتنے زور سے روتے تھے کہ سارے گاؤں کو پتہ چل جاتا تھا کہ کسی کے گھر ایک اور بچے نے جنم لیا ہے۔ ہاں تو کہنا یہ تھا کہ نمبردار کی چوتھی بیٹی جس وقت پیدا ہوئی لاڈو دائی جلدی میں تھی

کیونکہ اسے نائب تحصیلدار کے ہاں بھی جانا تھا جس کی بیوی کو سویرے سے درد ہو رہا تھا اور وہاں سے اسے کم سے کم پانچ روپے فیس ملنے کی امید تھی اور اگر اللہ کے کرم سے بیٹا ہوا تو دس روپے انعام بھی۔ سو اس نے جلدی جلدی نال کاٹ پھر بچی کو نہلایا بھی لیکن منہ میں انگلی ڈال کر گلے کا سوراخ بڑا کرنا بھول گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اس بچی کے منہ سے کبھی کسی نے اونچی آواز نہیں سنی اور جب پانچ برس کی عمر میں بولنا شروع کیا تو نہ صرف تتلا کر، بلکہ ہکلا کر اور جب دوسرے بچوں اور بچیوں نے اس کا مذاق اڑایا اور اس کے ہکلا کر بولنے کی نقل کر کے ہنستے تو اس نے منہ پر گویا تالا ہی لگا لیا۔ بس کوئی بہت ہی ضروری بات ہوتی تو رک رک کر دو چار لفظ بولتی اور پھر چپ ہو جاتی اور کبھی بات کرتی بھی تو وہ اتنی سیدھی اور بچکانہ ہوتی کہ سننے والے بے اختیار ہنس پڑتے اور کہتے ــــ بڑی بھولی ہے بچاری۔

نمبردار کے سات بچے تھے۔ تین لڑکے اور چار لڑکیاں۔ جن میں سب سے چھوٹی بھولی تھی گھر میں کھانے پینے کو کافی تھا۔ دودھ، دہی، مکھن کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ سب کی صحت بڑی اچھی تھی۔ بڑا لڑکا سریندر چودہ برس کی عمر میں بھی باپ کے برابر لمبا اور صحت مند تھا۔ اس سے چھوٹی رادھا تیرہ برس کی عمر میں اچھی خاصی خوبصورت عورت لگتی تھی نمبردار نے رادھا کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ لڑکے کا باپ بھی پاس کے گاؤں کا نمبردار تھا۔ اور لڑکا شہر میں میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہوا تھا۔ رادھا کی سسرال کی دیکھا دیکھی نمبردار نے اپنے بیٹوں کو بھی آگے پڑھنے کے لئے شہر میں بھیجدیا۔ اب گھر میں صرف لڑکیاں رہ گئیں۔ منگلا جو بارہ برس کی تھی اور جس کی شادی کی بات چیت بھی ہو رہی تھی چمپا دس برس کی تھی مگر نمبردار کی بیوی کا ارادہ تھا کہ منگلا کے ہاتھ پیلے کرتے ہی چمپا کی سگائی بھی کہیں کر دی جاتے۔

مگر رات کو جب کھانے کے بعد آنگن میں نمبردار کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا تو اکثر اپنی بیوی سے کہتا۔ سریندر کی ماں۔ اور سب بچے تو ٹھکانے لگ جائیں گے، مگر اس کمبخت بھولی کا کیا ہوگا۔ اس کو کون بیاہے گا؟ وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتی۔

"جو بھگوان کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔"

اور اپنی چھوٹی سی پلنگڑی پر لیٹی ہوئی پانچ سال کی بچی سوچتی: "یہ بیاہ کیا ہوتا ہے؟ اور بھگوان کہاں رہتا ہے؟"

بھولی سات برس کی تھی کہ منگلا کا بیاہ بھی ہو گیا اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔ اسی برس ان کے گاؤں میں لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول بھی کھل گیا۔ تحصیلدار صاحب اسکول کا افتتاح کرنے آئے تو انھوں نے نمبردار سے کہا تم کو اپنی لڑکیوں کو بھی اسکول میں داخل کرانا چاہئے تاکہ دوسرے

گاؤں والوں کے سامنے اچھی مثال قائم ہو۔

اس رات نمبردار نے اس معاملے میں بیوی سے صلاح کی۔ اس نے کہا: پاگل ہوئی ہو لڑکیاں اسکول میں پڑھنے جائیں گی تو بدنام ہو جائیں گی پھر ان کو بیاہیگا کون؟ پھر چمپا کی تو اب سگائی ہوگئی ہے۔ کون جانے اس بات پر وہ لوگ انکار ہی نہ کر دیں۔

پھر نمبردار نے اسے سمجھایا: یہ سرکاری معاملہ ہے، تحصیلدار صاحب کو معلوم ہوا تو خفا ہونگے کون جانے مجھے برخاست ہی کر دیں۔ یہ سرکار نہ جانے لڑکیوں کو پڑھانے کے پیچھے کیوں پڑی ہے پھر یہ نمبردار، ذیلدار، پٹیل اور پٹواری کو حکم دیا جاتا ہے کہ دوسرے گاؤں والوں کے لئے مثال قائم کرو۔ میں تو بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں!

نمبردار کی بیوی سمجھدار تھی۔ بولی: میں بتاؤں، بھولی کو اسکول میں داخل کر دو۔ ویسے بھی اس بے چاری کو کون بیاہنے والا ہے نہ صورت نہ شکل ہے، نہ بھیجے میں عقل ہی ہے۔

نمبردار نے بیوی کی رائے سے اتفاق کیا اور اگلے دن بھولی کو اسکول میں داخل کرانے لے گیا۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اسکول کیا ہوتا ہے۔ جب باپ نے کہا کہ چل میرے ساتھ تو وہ سمجھی کہ اسے گھر سے نکال رہے ہیں۔ جیسے لکشمی کو نکال دیا تھا۔ لکشمی ان کی ایک بوڑھی گائے تھی جس سے بھولی بہت پیار کرتی تھی۔ اس لئے کہ یہ گائے کبھی اس کا مذاق نہیں اڑاتی تھی نہ اس سے اوندھے سیدھے سوال کرتی تھی جن سے بھولی کو اپنی جہالت اور کمتری کا احساس ہو۔ باپ کی طرح سے ڈانٹتی بھی نہیں تھی اور ماں کی طرح اسے کوستی بھی نہیں تھی۔ صرف اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے بھولی کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی کبھی اپنی گرم گرم گلابی زبان سے بچی کے گالوں کو چاٹتی تھی۔ لکشمی بوڑھی ہوگئی تھی اب وہ دودھ نہیں دیتی تھی۔ اب وہ کبھی بچھڑا بھی نہیں دے سکتی تھی بس کھڑی کھڑی ہنکا کرتی تھی۔ سو نمبردار نے چپکے سے ایک قصائی کے ہاتھ سے پچیس روپے لے کر لکشمی کو گھر سے نکال دیا تھا اور قصائی لکشمی کو رسی سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ سوائے بھولی کے جو لکشمی کے ڈکرانے کی آواز سن کر گھر سے نکل آئی تھی۔ اس نے قصائی کے ہاتھ سے رسی چھڑانے کی کوشش کی مگر قصائی نے جھٹکا مار کر رسی چھڑالی اور بھولی دور جا گری وہ چلانا چاہتی تھی میری لکشمی کو مت لے جاؤ۔ میری لکشمی کو مت لے جاؤ۔ مگر غم اور غصے سے اس کی ہکلاہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ اور اس کی زبان سے سوائے ہے ...... ہے ...... ہے ...... ہے کے اور کچھ نہیں نکلا۔ غریب لکشمی پیچھے مڑ مڑ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بھولی کی طرف دیکھتی رہی مگر قصائی اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا اور بھولی وہیں زمین پر پڑی روتی رہی۔

سو جب اس کے باپ نے بھولی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور کہا چل میرے ساتھ تجھے اسکول میں

چھوڑ کر آؤں؛ تو وہ سمجھی کہ لکشمی کی طرح مجھے بھی کسی قصائی کے حوالے کیا جا رہا ہے اور وہ زمین پر پچھاڑیں کھا کر رونے لگی۔

"اری مری کیوں جا رہی ہے؟ اسکول ہی تو لے جا رہا ہوں ماسٹرنی کے پاس۔ کسی قصائی کے حوالے تو نہیں کر رہا۔" نمبردار نے ڈانٹ کر کہا، اور بیوی کو حکم دیا، "ذرا اسے کوئی ڈھنگ کے کپڑے تو پہنا دو۔ اسکول میں دوسری بچیاں کیا کہیں گی۔"

بھولی کے لئے کبھی نئے کپڑے بنے ہی نہیں تھے۔ چمپا کے جو کپڑے چھوٹے ہو جائیں یا پھٹ جائیں وہی بھولی کو مل جاتے تھے۔ پھر ان کو کبھی نہ دھویا جاتا تھا نہ ان کی مرمت ہوتی۔ میلے چیکٹ ہو جاتے پھٹ پھٹ کر چیتھڑے ہو جاتے تب بھی اس کو دوسرا جوڑا نصیب نہ ہوتا مگر آج ماں نے اسے چمپا کا ایک پرانا مگر اچھا صاف جوڑا پہنا نا۔ سر میں کڑوا تیل ڈال کر چوٹی گوندھی تب بھولی کو اطمینان ہوا کہ اسے قصائی کے حوالے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ شاید کسی اچھی جگہ لے جایا جا رہا ہے۔

بھولی جب اسکول پہنچی تو پڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ نمبردار تو بڑی استانی کے سپرد کر کے چلا آیا اور بھولی گھبرا گھبرا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کئی کمرے تھے اور ہر کمرے میں اس جیسی کتنی ہی لڑکیاں چٹائی پر بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ بڑی استانی نے اسے ایک کمرے کے کونے میں سب سے پیچھے بٹھا دیا۔ ابھی تک بھولی کے یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سکول کیا ہوتا ہے اور وہاں بچے کیوں آتے ہیں۔ مگر اتنی بہت سی بچیوں کو دیکھ کر اسے اطمینان سا ہو گیا۔ اس کی بہنیں تو اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی تھیں شاید ان لڑکیوں میں سے کوئی اس کی سہیلی بن جائے، جیسے لکشمی اس کی سہیلی تھی۔ اور گائے کو یاد کر کے وہ پھر اداس ہو گئی۔

استانی اور بچیوں کی کچھ غیر متعلق آوازیں کمرے میں گونج رہی تھیں، مگر نہ تو بھولی کے سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور نہ ہی اسے ان کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی تھی۔ اسے تو دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں میں دلچسپی تھی۔ ارے واہ واہ کتنی اچھی اچھی رنگین تصویریں ہیں۔ بالکل جیسے سچ مچ کی ہوں۔ لال لال گھوڑا جیسے گھوڑے پر تحصیلدار صاحب بیٹھ کر گاؤں میں آتے تھے۔ اور کالی کالی بکری جیسے اس کے پڑوسی تیلی کی بکری ہے۔ اور لال لال چونچ کا ہرا ہرا طوطا جیسا اس نے آموں کے باغ میں دیکھا تھا۔ اور کالی کالی چتیوں والی گائے۔ بالکل لکشمی جیسی..... دفعتاً بھولی نے دیکھا کہ استانی اس کے پاس کھڑی ہے اور اس سے سوال کر رہی ہے۔ بھو..... بھو..... بھو، اور ہکلاہٹ کے مارے وہ اپنا نام بھی نہ بتا سکی۔

ایک لڑکی بولی "بہن اس کا نام بھولی ہے۔ بھولی" اور ساری کلاس کی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑیں۔ اور بھولی کو ایسا لگا جیسے ان کی ہنسی کے طمانچے اس کے گالوں پر پڑ رہے ہیں اور

شرم اور غصّے سے وہ لال ہوگئی اور دانت کچلچا کر اس نے اپنا نام ادا کرنا چاہا۔

"بھو..... بھو..... بھو.....،"

اور پھر وہ رونے لگی..... زور زور سے ..... ڈھاڑیں مار مار کر، یہاں تک کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ جب اسکول ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور سب لڑکیاں کلاس چھوڑ کر بھاگیں تب بھی بھولی وہیں بیٹھی رہی، سر جھکائے سسکیاں لیتی رہی!

"بھولی"

تو اسے سب ہی کہتے تھے۔ حقارت سے۔ نفرت سے۔ مذاق سے مگر استانی کی آواز میں ایسی نرمی تھی کہ بھولی کو ایسا لگا جیسے اس کے دل کے زخموں پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ استانی اس کے پاس کھڑی ہے۔

"اٹھو" استانی نے کہا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب اپنا نام بتاؤ" بھولی کو اس ڈر سے پسینہ آگیا کہ پھر اسے اپنی ہکلاہٹ کے مارے ذلیل ہونا پڑے گا۔ پھر بھی اس مہربان استانی کی خاطر اس نے کوشش کی۔

بھو..... بھو..... بھو....."

"شاباش" شاباش۔ پورا نام بتاؤ۔

"بھو..... بھو..... بھولی" آخر کار نام پورا ہو ہی گیا اور بھولی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے بہت بڑا کام کیا ہو۔

"شاباش" استانی نے اسے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"جب تمہارے دل سے ڈر نکل جائے گا تو تم اور سب کی طرح بولنے لگو گی"

بھولی کی آنکھوں نے استانی سے پوچھا "سچ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ بس تم روز اسکول آیا کرو۔ آؤ گی نا؟"

بھولی نے سر ہلا کر "ہاں" کہا۔

"یوں نہیں۔ زبان سے ہاں کہہ کر کہو۔ اگر تم سچ مچ یہاں آنا چاہتی ہو تو ہاں تمہاری زبان سے فوراً نکل آئے گا۔

"ھ..... ھ..... ہاں!" اور بھولی حیران رہ گئی کہ یہ کیسے ہوا۔

"دیکھا تم نے؟" یہ لو کتاب"

کتاب رنگین تھی اور اس میں بڑی اچھی اچھی تصویریں تھیں۔ کتّا، بلّی اور بکرا اور گھوڑا اور طوطا اور شیر اور گائے، لکشمی جیسی گائے۔ ساتھ میں اردو کے کچھ لفظ بھی لکھے تھے۔

یہ کتاب پڑھنا تو تمہیں ایک مہینہ میں آجائے گا، بھولی — پھر تم اس سے بڑی کتاب پڑھوگی۔ پھر اس سے بڑی..... اور پھر تم سب گاؤں والوں سے زیادہ پڑھ جاؤگی پھر تمہارا کوئی مذاق نہیں اڑائے گا۔ ہر کوئی تمہاری عزت کرے گا۔ اور جو بات بھی تمہارے دل آئے گی تم اس کا اظہار کر سکوگی۔ سمجھیں تم؟ "شاباش! اب جاؤ۔ کل سویرے آنا"

بھولی کو ایسا لگا جیسے مندر کے گھنٹے ایک دم بج پڑے ہوں۔ جیسے اسکول کے سامنے اُگے ہوئے کیکر کے پیڑ پر ایک دم سے لال لال پھول نکل آئے ہوں، جیسے وہ اپنی ہکلاہٹ کو دور کر کے وہ سارے گیت گانے لگی ہو جو اس کی بہنیں گایا کرتی تھیں اور جنہیں آج تک وہ نہ گا سکی تھی۔

اس نے سوچا جب میں گھر جاؤں گی اور باپو اور ماں اور چمپا مجھ سے پوچھیں گے کہ اسکول کیسا لگا تو میں انھیں بتا دوں گی کہ اسکول کتنا بڑا ہے اور استانی کتنی اچھی ہے اور انھیں یہ خوبصورت کتاب دکھا دوں گی اور اس میں بنی ہوئی رنگین تصویریں۔ اور ان سے بات کرتے ہوئے میں ایک بار بھی نہیں ہکلاؤں گی۔

مگر جب وہ گھر پہنچی تو اس کے باپ نے کچھ نہیں پوچھا۔

اس کی ماں نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ صرف اتنا کہا۔ "ذرا یہ کتاب اور بستہ اتار کر سنبھال کر رکھ گھر میں دھول مٹی میں خراب کرے گی تو پھر خوب ہی درگت بنا دوں گی تیری"

اور چمپا نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ اور وہ اپنی ریشمی شلوار سیتی رہی جو اس کے جہیز کے لئے بن رہی تھی۔

سو بھولی کسی کو کچھ نہ بتا سکی۔ کاش لکشمی ہی ہوتی تو وہ اسے ہی اپنے اسکول اور اپنی استانی اور اپنی کتاب کے بارے میں بتاتی اور کہتی۔ دیکھ لکشمی کسی کو کہنا نہیں مگر میں ایک دن میں سب کی طرح سے فرفر باتیں کر دوں گی۔ استانی جھوٹ تھوڑی بولتی ہے۔

مگر لکشمی تو کب کی قصائی کی چھری تلے آچکی تھی سو بھولی چپ چاپ اپنے کونے میں بیٹھی رہی اور اس نے اپنی کتاب کو اناج کی کوٹھی میں چھپا دیا مگر اس کا دل دھڑک دھڑک کر اعلان کر رہا تھا۔

"بھولی بولے گی۔ بھولی بولے گی"

اور یوں سات برس گزر گئے۔

بھولی اسکول جاتی رہی۔ اس لئے کہ نمبردار کو اپنی ایک بیٹی کو توپڑھا کر گاؤں کے لئے مثال قایم کرنی چاہیئے

چمپا کا بیاہ ہو گیا۔ سریندر بی۔ اے کر کے شہر کے ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔

نمبردار نے اپنے کچے مکان پختہ کروالیا۔

گاؤں کی آبادی اتنی بڑھی کہ وہاں اسکول کے علاوہ ایک ٹنبو والا سینما بھی قائم ہوگیا۔ اور ایک کپاس کو صاف کرنے کا کارخانہ اور اب تو ڈاک گاڑیاں بھی ان کے اسٹیشن پر رکنے لگیں اور تحصیلدار تو کیا اب تو کبھی کبھی کلکٹر صاحب اور ایک بار تو منسٹر بھی وہاں کا دورا کرنے لگے۔

ایک رات کو اپنے پکے نئے مکان کی چھت پر پلنگ پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے نمبردار نے بیوی سے کہا۔ "تو پھر بشمبر کو ہاں کہدوں؟"

"ہاں تو اور کیا۔ اس سے اچھا بر بھلا اس نگوڑی کو کہاں ملے گا۔ اچھی بڑی دکان ہے اپنا مکان ہے۔ آٹھ دس ہزار روپے نقد بھی ہیں۔ پھر بے چارہ جہیز دان کچھ نہیں مانگتا۔

وہ ٹھیک ہے۔ مگر عمر ذرا زیادہ ہے نا؟" پہلی بیوی کے بچے بھی بڑے بڑے ہیں۔

تو پھر کیا ہوا؟ چالیس پچاس کی عمر بھی کوئی عمر ہووے ہے کیا۔ اب اس کلموہی کے لئے کوئی راج کمار آئے گا کیا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ بشمبر دوسرے قصبے کا ہے۔ نہیں تو کاہے کو کوئی پیغام دیتا۔ یہ رشتہ نہ ہوا تو پھر عمر بھر کنواری رہے گی اور ہماری چھاتی پر مونگ دلے گی۔

نمبردار نے کہا۔ "پھر بھی ڈرتا ہوں نہ جانے لڑکی کیا کہے گی؟"

"ارے وہ پگلی کیا کہے گی۔ بھیجے میں عقل نہیں۔ منہ میں زبان نہیں۔ وہ تو بے چاری گائے ہے گائے۔ لکشمی کو تم نے قصائی کے حوالے کر دیا تھا، وہ کچھ بولی تھی کیا؟"

"تم بھی ٹھیک ہی کہتی ہو۔" اور پھر وہ حقہ گڑگڑانے لگا۔ اور بھولی جو ابھی سوئی نہیں تھی اور یہ سب سن رہی تھی۔ بڑی دیر تک آسمان کو تکتی رہی۔ جہاں لاکھوں ستارے جھلملا کر نہ جانے اس سے کیا کہہ رہے تھے۔

بشمبر ناتھ جس کی دوسرے قصبے میں پنساری کی دکان تھی۔ جہاں پر وہ ہلدی۔ دھنیا، نمک گھی بیچتا تھا بڑی بھاری برات لے کر آیا۔ نمبردار رام لال کی تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں۔ اتنے کیا معلوم تھا کہ اس کی چوتھی بیٹی کی قسمت یوں چمکے گی۔ رادھا، منگلا، چمپا جو اپنی سسرال سے بھولی کے بیاہ میں شرکت کرنے آئی تھیں برات کے ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر جل ہی تو گئیں۔

"اس پگلی ہکلی مردار کی یہ قسمت؟" منگلا نے کہا۔

پھر رادھا نے کہا۔ "اری اس کے دولہا کو بھی دیکھا ہے۔ مونچھوں میں خضاب لگاتا ہے۔"

اور چمپا بولی۔ "میں نے سنا ہے لنگڑاتا بھی ہے۔"

"ہاں۔ اور ... بڑے بڑے تو لڑکے ہیں اس کے۔"

اور یہ سب سوچ کر ان کو تھوڑی بہت تسلی ہوگئی کہ برات شاندار سہی، مگر بھولی کا دولہا تو لنگڑا ہے، بڈھا ہے۔ براتیوں کو بار پان تقسیم ہو رہے تھے۔ بینڈ باجا ایک فلمی دھن بجا رہا تھا۔

"دلہنیا چھما چھم چھما چھم چلی"
پروہت نے کہا: مہورت کا وقت ہوگیا۔ اب کنیا دان ہونا ہی چاہیئے"
بشمبر ناتھ تو بے تابی سے خود ہی سہرا ہلاتا ہوا ہون کنڈ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔
"لڑکی کو لاؤ۔ لڑکی کو لاؤ"
آوازیں باہر سے اندر کی طرف گئیں۔
ماں نے بھولی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ آ بھولی۔ تو بڑی قسمت والی ہے۔
بھولی نظریں جھکائے باہر آئی۔ زیور اور بھاری کپڑوں کے بوجھ سے دبی ہوئی۔ ہون کنڈ کے پاس اسے دولھا کے برابر پیڑے پر بیٹھا دیا گیا۔
بشمبر ناتھ کے ایک دوست نے کہا: چل بھئی بشمبر۔ کنیا کو ہار پہنا" اس نے ہار پہنا نے کو اٹھایا، پاس کھڑی ہوئی ایک عورت نے گھونگھٹ سرکا دیا۔ بار بشمبر کے جھری پڑے ہاتھوں ہی میں لرزتا رہا۔
"ٹھہرو" اس نے اپنے دوست سے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ مگر آس پاس والوں نے سن ہی لیا۔ دلہن کے منہ پر گھونگھٹ پھر آگیا۔
ارے اس کے منہ پر تو چیچک کے داغ ہیں" بشمبر نے کہا۔
"تو اب کیا ہو سکتا ہے۔ تو بھی کونسا جوان بیٹھا ہے"
اس کے دوست نے سمجھایا۔
"ارے یہ ایسی تھی تو ہمیں کم سے کم پانچ ہزار مانگنا چاہیئے تھا۔
یہ پہلے سوچنا چاہیئے تھا۔ اب کیا برات واپس لے کر جاتیں گے؟"
"نہیں نمبردار سے کہو پانچ ہزار لاتے"
نمبردار رام لال کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اتنی ذلت اس کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔
آج اس کمبخت بھولی کے ہاتھوں اس کی عزت کو یوں لٹنا تھا، اور پھر ایک نہ دو، پورے پانچ ہزار۔ اتنی بڑی رقم وہ کیسے دیدے۔ مشکل سے عمر بھر جوڑ کر رشوتیں لے لے کر چھ سات ہزار روپیہ تو اس نے جمع کئے تھے۔
اس نے بشمبر کے پاؤں میں اپنی پگڑی ڈال دی۔
"میری عزت کا سوال ہے۔ بیٹا۔ دو ہزار دیتا ہوں ابھی"
"نہیں پانچ ہزار۔ ورنہ ہم جاتے ہیں"
"کچھ تو خیال کرو، تو برات واپس لے گیا تو میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔

"تو پھر نکالو پانچ ہزار۔"
روتا ہوا نمبردار اندر گیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے الماری کھولی۔ نوٹ گنے اور پورے پانچ ہزار دولہا کے آگے ڈال دیئے۔
بشمبر کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ "لاؤ جی۔ اب ہار دو۔"
ایک بار پھر دلہن کا گھونگھٹ سرکا یا گیا، مگر اس بار اس کی نظریں جھکی ہوئی نہ تھیں۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر کو گھور رہی تھی اور آنکھوں میں نفرت نہیں غصہ نہیں صرف حقارت تھی۔
بشمبر کا ہاتھ اٹھا کہ ہار بھولی کے گلے میں ڈال دے مگر اس سے پہلے بھولی کا ہاتھ بجلی کی طرح کوندا اور اس نے ہار چھین کر پھینک دیا۔ اسی لمحے پیڑھے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔
سارے مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں کمبخت بدصورت بھی ہے اور بے شرم بھی کیا زمانہ آیا جی۔ اسے تو سب بھولی سمجھتے تھے......
"پتا جی!" بھولی کی آواز گونجی اور اس بار اس میں ہکلاہٹ کا شائبہ بھی نہ تھا۔
اس کا باپ، اس کی ماں، اس کے بھائی اور بہنیں اور گاؤں کے لوگ یہ سن کر حیران رہ گئے۔
"پتا جی اٹھایئے اپنے پانچ ہزار مجھے اس سے بیاہ کرنا منظور نہیں ہے۔"
"بھولی، اری بھولی کمبخت کیا کر رہی ہے۔ ماں باپ کی ناک کاٹنا چاہتی ہے کیا۔ کچھ تو ہماری عزت کا خیال کر۔"
"تمہاری عزت کی خاطر میں اس بڈھے لنگڑے سے بیاہ کرنے کو تیار تھی، مگر اس لالچی کمینے سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔" یہ لفظ دہرائے جا رہی تھی جیسے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔
"ارے ہم تو اسے گائے سمجھتے تھے۔ گائے۔"
بھولی یہ کہنے والے کی طرف تیزی سے گھومی۔ "ہاں خالہ! مجھے سب گائے سمجھتے تھے۔ تبھی اس قصائی کے حوالے کئے دے رہے تھے۔ پر اب ہکلی بول رہی ہے اور بھولی اتنی بھولی نہیں رہی کہ جان کر اس دوزخ میں گر پڑے۔"
بشمبر ناتھ گالیاں بکتا ہوا برات کو واپس لے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی خوفناک انتقام کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ نمبردار رام لال سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی بیوی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جب سب باہر والے چلے گئے۔ اور ہون کنڈ کی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ تب رام لال نے بیٹی کی طرف دیکھا اور بولا۔
"جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب تیرا ہوگا کیا؟"

اور وہ جو بھولی تھی، اور جو ہکلی تھی، اور وہ جسے سب بے وقوف اور پاگل سمجھتے تھے بولی "گھبراؤ نا پتاجی۔ بڑھاپے میں تمہاری اور ماں کی خدمت کروں گی۔ اور جہاں میں نے پڑھا ہے اس اسکول میں بچوں کو پڑھاؤں گی۔ کیوں آپا جی ٹھیک ہے نا؟"

استانی جو ایک کونے میں کھڑی تھی بولی۔

"ہاں۔ بھولی۔ ضرور۔" اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں وہ روشنی تھی جو ایک مصنف کی آنکھوں میں ہوتی ہے جب وہ اپنے شاہکار کی آخری سطر لکھتا ہے جو ایک مصوّر کی آنکھوں میں ہوتی ہے، جب وہ اپنی تخلیق کی ہوئی تصویر کو مکمل دیکھتا ہے۔

(بشکریہ ہندوستانی ادب)

# آئینہ خانے میں

ساٹھ برس تک وہ مجھ سے کتراتا رہا۔ مگر پھر آخر ایک دن ہمارا آمنا سامنا ہو ہی گیا۔
میں نے کہا "بات کیا ہے؟ میں نے تو کبھی تمہیں قرض نہیں دیا۔ پھر ہمیشہ کیوں مجھ سے آنکھیں چراتے ہو؟"

اس نے کہا۔ میں تم سے شرماتا بھی ہوں، ڈرتا بھی ہوں۔ مگر میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں دنیا میں اگر کسی سے محبت کرتا ہوں تو صرف تم سے۔ محبت کیا ہے اور نفرت کیا ہے؟ سچ پوچھو تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ محبت اور نفرت دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ شاید اسی لئے میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سمجھتے ہو میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔

میں نے کہا۔ آج مل ہی گئے ہو تو دو دو باتیں ہو جائیں۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جاننا ہوں۔ سب کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

یوں کہو میرے ڈھول کا پول کھولنا چاہتے ہو۔ اس نے کہا۔ تب ہی تو میں تمہارا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ کیوں دنیا کے سامنے میری مٹی پلید کرنا چاہتے ہو؟ بہت سے ایسے چہرے ہیں جن پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہے۔

مگر میں نے تو کبھی کسی آئینے پر پردہ پڑا نہیں دیکھا۔ اور کہا جاتا ہے آئینہ جھوٹ نہیں بولتا ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں دُبلا آدمی موٹا نظر آتا ہے، دوسرا آئینہ ہوتا ہے جس میں چھوٹے قد کا آدمی لمبا دکھائی دیتا ہے۔ بدصورت سے بدصورت آدمی کو آئینے میں اپنا چہرہ خوبصورت ہی لگتا ہے۔ اگر آئینے سچ بولتے تو دنیا میں ایک آئینہ بھی نہ بچتا۔ سب چکنا چور کر دیئے جاتے۔

اس نے کہا "تو پھر مجھے بھی ایک آئینہ سمجھو۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ پھر

بتاؤ کیا دکھائی دیتا ہے ؟"

وہ ایک چھوٹے قد کا گنجا سا آدمی ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ۔ آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے جیسے کتنی ہی راتوں سے نہ سویا ہو ۔ چہرے پر بڑھاپے کی جھرّیاں تو نہیں ہیں مگر ماتھے پر گہری لکیریں بتارہی ہیں کہ غم کے کتنے ہی طوفان اس پر سے گذر گئے ہیں ۔ جیسے اس کے زندگی کا ہر برس سات سو تیس دن کا گذرا ہو ۔

میں نے پوچھا کیا تم اسے پہچانتے ہو ؟ پہلے کبھی دیکھا ہے اسے ؟ "

اس نے کہا ، صورت جانی پہچانی لگتی ہے مگر یاد نہیں آتا ، کہاں اور کب دیکھا ہے ؟ "

میں نے کہا ۔ غور سے دیکھو ۔ کہیں آئینے میں اپنی صورت تو نہیں دیکھ رہے ہو ۔"

اس نے کہا ، لاحول ولا قوۃ ۔ کیا تم مجھے اتنا بدصورت سمجھتے ہو ، انٹلیکچولز کی طرح میرا ماتھا اونچا ضرور ہے مگر میں گنجا نہیں ہوں ۔ مانا کہ بیل جیسے دیدے نہیں ہیں میرے مگر آنکھیں اتنی چھوٹی بھی نہیں ہیں جیسے کسی نے ریت میں تھوک دیا ہو ۔ نہیں جی ۔ میں اس گنجے کھوسٹ کو نہیں جانتا ۔"

میں نے کہا ، دوست ! یہی تو مشکل ہے ۔ انسان چاند کا جغرافیہ جانتا ہے مگر اپنا چوکھٹا نہیں پہچانتا ۔"

وہ چڑ کر بولا ، کیا کہا ؟ "

کچھ نہیں ، میں تو تمہاری زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا ۔

کیوں ؟ "

، ایک مضمون لکھنا ہے اپنے بارے میں ۔ مطلب یہ کہ تمہارے بارے میں ۔"

، کیا اس مضمون کے پیسے ملیں گے ؟ "

شاید ۔"

، تو یوں کہو مجھے بیچنا چاہتے ہو ؟ اور سب تو بیچ چکے ہو ۔ اپنا قلم ، اپنا دماغ ۔ سنا ہے اپنا دل بھی کئی بار گروی رکھ چکے ہو ۔ اب رہ کیا گیا ہے ۔ چلو مجھے بھی بیچ ڈالو ۔

" تو پھر اپنے حالات زندگی بتاؤ ۔"

" تاریخ پیدائش ۷ جون ۱۹۱۴ء ۔ تاریخ وفات ابھی معلوم نہیں ۔"

" ان دو تاریخوں کے درمیان میں کیا ہوا ؟ "

" سچ بتاؤں ؟ " اس نے پوچھا ۔

" ہاں ۔ بالکل سچ ۔"

"سچ تو یہ ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ میری ہستی سے دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ کوئی لیلیٰ مجنوں جیسا لازوال عشق نہیں ہوا۔ کوئی لافانی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آرٹ کا کوئی شاہکار تخلیق نہیں ہوا۔ کوئی نیا براعظم دریافت نہیں ہوا۔

تو پھر ساٹھ برس کی عمر میں تم نے کیا کیا؟"

"جھک ماری۔ پچاس ہزار گھنٹے دوستوں کے ساتھ گپ ماری۔ پچاس ہزار چائے کی پیالیاں پیں۔ ایک لاکھ سفید کاغذ کے ورق سیاہ کئے۔ پندرہ ہزار گھنٹے سینما کے اندھیرے میں کاٹے۔ سوا سو فاؤنٹن پین خریدے، گھسے اور کھوئے۔ سات ٹائپ رائٹروں کو پیٹ پیٹ کر کھٹارہ بنا دیا۔ پانی پت، علی گڑھ، دہلی اور بمبئی، ہانگ کانگ، شنگھائی، ٹوکیو، پیکنگ، لندن، پیرس نیویارک اور ماسکو کی سڑکیں ناپیں۔

"اس سب اوٹ پٹانگ پروگرام سے تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ تم کرتے کیا رہے؟ آخر تمہارا پیشہ کیا ہے؟"

"ادیب اور نقاد کہتے ہیں میں ایک اخبارچی ہوں۔ جرنلسٹ کہتے ہیں میں فلم والا ہوں فلم والے کہتے ہیں میں ایک سیاسی پروپیگنڈسٹ ہوں۔ سیاستداں کہتے ہیں میں کمیونسٹ ہوں۔ کمیونسٹ کہتے ہیں میں بورژوا ہوں....."

"مگر تم سچ مچ ہو کیا؟"

"کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟" — "سچ یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں۔"

پھر بھی سنا ہے تم نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔"

"یہ الزام تو لگایا گیا ہے مگر آپ ثابت نہیں کر سکتے — ایک تنقید نگار نے تو میری پہلی کتاب پڑھ کر فتویٰ دے دیا تھا کہ کتاب میں نے کسی اور سے لکھوا کر اپنے نام سے چھپوا دی ہے۔"

"سنا ہے تم نے کئی فلمیں بھی بنائی ہیں؟"

"آہستہ بولو۔ کہیں کوئی فنانسر نہ سن لے۔ اور ڈگری لے کر میرا پلنگ اور تین کرسیاں اور ستائیس من پرانی کتابیں اور سترہ من ردی کا غذ قرقی کرنے نہ آجائے۔

اچھا یہ بتاؤ۔ تمہارے دل کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ دل چاہتا ہے کہ میرے سر پر گھنے سیاہ بال اُگ آئیں اور ایک بار میں پھر جوان ہو جاؤں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ٹالسٹائی کے "وار اینڈ پیس"

جیسا ناول لکھ دوں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ایک ایسا فلم بنادوں جس کا ساری دنیا میں چرچا ہو۔ دل چاہتا ہے میں ماؤنٹ ایوریسٹ پر چڑھ جاؤں، اسپوتنک میں بیٹھ کر چاند کی سیر کرآؤں، دل چاہتا ہے میرے پاس ایک خاص اپنا کمرہ ہو جس میں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں ہوں اور ایک ریڈیوگرام ہو۔ اور دنیا کی بہترین موسیقی کے ریکارڈ ہوں، اور زمین پر چٹائی کا فرش ہو۔ اور لیٹنے کے لئے ایک گدّا ہو۔ ایک بجلی کا سماوار ہو جس میں ہر وقت چائے بنتی رہے۔ کئی فاؤنٹین پین ہوں، ایک بہت بڑی رُوشنائی کی بوتل ہو۔ اور سوریم کاغذ ہو اور وقت ہو —— اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے کے لئے۔ اپنی پسند کی کتابیں اور کہانیاں لکھنے کے لئے اپنے خاص دوستوں سے گپ کرنے کے لئے، سونے کے لئے وقت ہو اور کبھی کبھی سوچنے کے لئے بھی وقت ہو۔"

تو پھر یہ بھی بتاؤ کہ تم نے لکھنا کب شروع کیا اور کیوں؟"

"میں نے لکھنا شروع کیا جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ مگر کیوں؟ اس کی وجہیں تین تھیں میرا ٹھگنا قد اور دُبلا پتلا جسم، کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس میں میں سب سے بُرا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا اور یونیورسٹی میں صرف کھلاڑیوں ہی کی قدر کی جاتی تھی۔ مگر میرا جی چاہتا تھا کہ میرا بھی نوٹس لیا جائے میں بھی کوئی ایسا کام کردوں کہ یونیورسٹی میں میرا چرچا ہو۔ سو میں نے یونین کی ڈیبیٹس میں حصّہ لینا شروع کیا۔ پھر یونیورسٹی میگزین میں لکھنا شروع کیا۔ پھر افسانے لکھے ..... پھر کتابیں.....

دوسری وجہ؟ —— برٹش سامراج جس نے مجھے پہلے مقرر، پھر جرنلسٹ اور پھر مصنّف بنا دیا جلیانوالہ باغ والے قتل عام سے اگلے برس کا ذکر ہے، میں شاید پانچ چھ برس کا تھا۔ جب ہمارے قصبے کے سینکڑوں بچوں کو ترنیلی سڑک کے کنارے کھڑا کیا گیا، صبح سے شام تک سڑک پر فوج کے گھوڑسوار رسالے گذرتے رہے اور لال منہ کے انگریز سپاہی، ان کی بندوقیں، رائفلیں، سنگین مشین گنیں، توپیں دیکھ دیکھ کر بچوں کے دل دہلتے رہے اور یہی اس پریڈ کا مقصد تھا کہ بچوں کے دل میں سامراج کی فوجی طاقت کی دہشت بٹھادی جائے۔ مگر نتیجہ اس کا الٹ نکلا۔ ایسی ہی ایک پریڈ پنجاب کے ایک اور قصبے میں ہوئی تھی۔ ایک بچے کے دل میں انگریزی سامراج کے لئے ایسی نفرت بیٹھ گئی کہ بڑا ہو کر وہ دہشت پسند انقلابی بن گیا۔ اس کا نام تھا بھگت سنگھ۔ ہزاروں اور بچوں نے بڑے ہو کر کسی انگریز پر پستول تو نہیں چلایا مگر ان کے دلوں میں بھی انقلابی، سیاسی خیالات پروان چڑھتے رہے۔ ان ہی میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں کمزور تھا۔ پستول اور بم نہیں چلاسکتا تھا۔ میں نے سوچا سامراج کے خلاف میرا ہتھیار میری آواز ہوگی۔ میرا قلم ہوگا۔

تیسری وجہ —— اٹھارہ برس کی عمر میں مجھے کسی سے محبّت ہوگئی۔ اور باوجود اور بہت سی محبتوں کے وہ پہلی محبت بیالیس برس بعد اب بھی جوان ہے۔ اور اکیس برس کی عمر میں

مجھے اس محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایسی حالت میں ناکام عاشق کے سامنے تین راستے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ خودکشی کرتا ہے۔ (مگر میں موت سے ڈرتا تھا اور اب بھی ڈرتا ہوں) یا وہ شاعری کرتا ہے اور شراب پیتا ہے (مگر مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی! اور شراب مجھے کڑوی اور بدبودار لگتی تھی) اور یا وہ افسانے لکھتا ہے اور ان افسانوں میں اپنے ناکام عشق کی داستان کو ڈھال کر اپنے گھائل دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ (اور سو یہی میں نے کیا۔)

میں نے پوچھا: "تو کیا تم سمجھتے ہو ہر ناکام عاشق افسانہ نگار بن سکتا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "ہر ایک ناکام عاشق افسانہ نگار نہیں بن سکتا مگر اس کو افسانہ نگار بنانے میں اس کی محبت کی ناکامی بھی مدد کر سکتی ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے قلمکار بننے کی تین وجہیں بتائی ہیں۔ ان تینوں کو اپنے ذاتی معاملے سے ہٹا کر ایک عام اصول کی طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ادب کی تخلیق کے تین محرک ہو سکتے ہیں۔ لکھنے والے کی اپنی انفرادیت اور خودی ـــ اس کے اپنے جذباتی تجربات و حادثات ـــ اور اس کا سماجی، اقتصادی اور سیاسی ماحول ـــ"

میں نے کہا: "تم اپنی کہانیوں اور ناولوں میں سماجی اور اقتصادی اور سیاسی ماحول پر اتنا زور دیتے ہو۔ شاید اسی لئے لوگ کہتے ہیں تم محض ایک جرنلسٹ ہو، ادیب نہیں ہو۔"

میری تخلیقات پر لوگ جو چاہے لیبل لگائیں مگر وہ وہی ہیں (اور وہی ہو سکتی ہیں)، جو میں ہوں۔ اور میں جو بھی ہوں، وہ جادو یا کسی معجزے کا نتیجہ نہیں ہے۔ ایک انسان اور اس کے سماج کے عمل اور ردعمل سے تخلیق ہوا ہے۔ انسان کا کیریکٹر ہی نہیں اس کی قسمت بھی داخلیت اور خارجیت دونوں کے تانے بانے سے بنتی ہے اور اس حقیقت سے کوئی نہیں انکار کر سکتا چاہے وہ مارکس کا چیلا ہو یا فرائڈ کا پیرو۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی بناوٹ میں نفسیات کا تانا زیادہ اہم ہے یا معاشیات کا بانا۔

اب میں اس کی باتوں سے خاصا بور ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے انٹرویو کا آخری سوال پوچھا: "کیا تم کوئی واقعہ بتا سکتے ہو جس کا تمہارے کیریکٹر اور زندگی پر گہرا اثر پڑا ہو؟"

ایسے تو ہزاروں واقعات ہیں۔ ہر ایک کی زندگی میں ہر روز کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا واقعہ ہوتا ہے جو بظاہر ہم بھول جاتے ہیں۔ مگر جو دل و دماغ پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ ان سب کو یاد کرنے اور بیان کرنے کے لئے تو پوری کتاب چاہئے پھر بھی وہ فوجی پریڈ والا واقعہ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ ایک اور سنائے دیتا ہوں۔ چاہو تو اسے ایک کہانی سمجھ لو ـــ مگر یہ ایک سچی کہانی ہے جس کا عنوان ہے.....

# اندھیرے کا ہمراہی

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۷ء جب آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر محفوظ مسلم علاقوں میں چلے گئے۔ صرف میں اور میری بیوی مجّی اپنی سمندر کے کنارے والی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند سنگھی سورماؤں اور لیگی مجاہدوں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں لیکن مجّی نے دو جو آج اس دنیا میں نہیں ہے، کہا اگر شیواجی پارک میں ہمارے لئے زندہ رہنا ناممکن ہے تو پھر زندہ رہنا ہی بے کار ہے اور سو ہم وہیں رہے۔

میں ان دنوں "بمبئی کرانیکل" اخبار میں کام کرتا تھا۔ ایک رات کو میں دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اترا۔ دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں۔ کرفیو لگا دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری گلی میں سے گذر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے۔ میں فطرتاً کوئی بہادر نہیں ہوں۔ اگر میں اس خطرناک زمانے میں اندھیرے اجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا) میں نے سوچا آج میری موت آگئی۔ مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیئے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آگیا ہے میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لئے وہ بے چارہ ٹھٹک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لئے میں نے پوچھا "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"

اس نے کہا۔ "ہاں نو بجے کا کرفیو ہے اِدھر۔ مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"شیواجی پارک۔ اور تم؟"

"میں بھی شیواجی پارک۔"

"وہاں رہتے ہو کیا؟"

"ہاں"

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا، اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا، اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا وسنت ڈیسائی ہے۔ اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ کیا، یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

سو میں نے کہا۔ "میرا نام ہے احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس"

اس نے کہا: "تم پیپر میں کام کرتے ہو نا؟"

میں نے کہا: "ہاں بمبئی کرانیکل میں"

"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو۔"

میں نے کہا: "ہاں، کئی برس سے ہم یہیں رہتے ہیں۔"

اور اتنے میں ہم پولیس کے سپاہیوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گذر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آ گئے۔ یہاں کرفیو نہیں تھا۔

میرے ہمراہی نے کہا۔ "میٹنگ میں چل رہے ہو عباس بھائی؟"

میں نے پوچھا، "کونسی میٹنگ؟"

"سورکشن دل بنا رہے ہیں۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہوں گے"

میں نے کہا، "چلو ضرور چلتا ہوں۔"

سو ہم دونوں اکٹھے اس جلسے میں شریک ہوئے۔ سو سوا سو آدمی موجود تھے اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے:

"آؤ آؤ۔ عباس بھائی آؤ"

چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ اپنے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے ایک سورکشن دل بنایا جائے کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چنا گیا اس کا نام تھا خواجہ احمد عباس۔

اور جن لوگوں نے میرے نام پر اپنے ہاتھ اٹھائے ان میں وہ بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھتا تھا۔

میں نے سوچا جلسے کے بعد اس سے ملوں گا مگر جلسے کے بعد جو افراتفری ہوتی ہے اس

میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ مگر اس آدمی نے میری زندگی کے ایک نہایت نازک موقعے پر انسانیت میں میرا اعتقاد (جو اس وقت ڈگمگا سکتا تھا) پھر مستحکم کر دیا۔ اور اپنی یادوں کے اندھیرے میں اب بھی اس گمنام انجانے ہمراہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں، اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں:

"احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔ جو ساٹھ برس ہوئے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔ میرے پڑنانا تھے۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ جن کی "مسدس حالی" کے تین سو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ لیکن جنہوں نے کبھی اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے اس کی رائلٹی کا ایک پیسہ نہیں لیا۔ کیوں کہ وہ کتاب انہوں نے قوم کو جگانے کے لئے لکھی تھی۔ اس کی بکری سے پیسے بنانے کے لئے نہیں۔ اور میرے باپ تھے خواجہ غلام السبطین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا۔ جنھوں نے ایک بار گھر کے نوکر چھوکرے کو "الو کا پٹھا" کہنے کی یہ سزا دی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بنا کھانا پانی کے بند کر دیا تھا۔ جب تک میں نے ہاتھ جوڑ کر اس لڑکے سے معافی نہ مانگی تھی اور اس طرح انھوں نے مجھے سکھایا تھا کہ سب انسان برابر ہیں۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں ہے۔ اور جنھوں نے مرتے دم میرے لئے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی، سوائے انسانیت کے چند اصولوں کے۔ اور میری والدہ تھیں سرور ۃ النساء بیگم۔ جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ کسی سیاسی پارٹی میں شریک ہوئی تھیں لیکن جو آخری دم تک تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا شکار نہ ہوئیں اور فسادات کے دنوں میں کتنی ہی تکلیفیں اٹھا کر بھی انسان دوستی کا دامن نہ چھوڑا۔ مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی بھی اولاد ہوں۔ میرے عزیز اور رشتے دار پاکستان میں تو ہیں ہی۔ مگر انسانیت اور سوشلزم کے ناطے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں ـــــ امریکہ اور روس میں، انگلستان، چین اور جاپان میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ جیسا کہ ایک یورپین شاعر جان ڈون نے کہا ہے۔

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے
ہر انسان زمین کا ایک ذرہ ہے
ہر انسان کی موت میری موت ہے

کیوں کہ میں اور انسانیت جدا جدا نہیں ہیں۔"

یہ کہہ کر آخر کار وہ خاموش ہو گیا۔

تب میں نے کہا، "بے شک، ساری انسانیت تمہارے اندر سمائی ہوئی ہے لیکن نہ بھولو کہ اور کسی سے زیادہ تم پر میرا حق ہے۔ اگر تم نے کبھی مجھے اپنے آپ سے جدا کیا تو تم کروڑوں میں سے صرف ایک اکائی رہ جاؤ گے۔ انسانیت عظیم ہے اس لئے کہ ہر انسان کی ایک خودی ہے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس خودی میں خدائی بھی ہے لیکن تم بھی اتنا تو مانو گے کہ انسان میں خودی ہے اور ہر خودی میں ایک انسان ہے۔ یعنی تم میں میں ہوں۔ جیسے مجھ میں تم ہو۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس نے میری آنکھوں میں اور پھر وہ "میری نگاہ کے آئینے میں ایسے کھو گیا جیسے "میں" اور "وہ" کبھی الگ ہوئے ہی نہیں تھے۔

# دیوالی کے تین دیے

## پہلا دیا:۔

دیوالی کا یہ دیا کوئی معمولی دیا نہیں تھا۔ دیئے کی شکل کا بہت بڑا بجلی کا لیمپ تھا۔ جو سیٹھ لکشمی داس کے محل نما گھر کے سامنے کے برآمدے میں لگا ہوا تھا۔ بیچ میں یہ دیوں کا سمراٹ دیا تھا اور جیسے سورج کے اردگرد اَن گنت ستارے ہیں، اسی طرح اس ایک دیئے کے چاروں طرف بلکہ اُوپر نیچے بھی ہزاروں بلب بجلی کے تاروں میں ایسے جگمگا رہے تھے جیسے مالن ہاروں میں چنبیلی کے سفید پھولوں کو گوندھتی ہے۔

برآمدے کے ہر محراب میں ان بجلی کے دیوں کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ چھت کے کنگروں کے ساتھ ساتھ ستاروں سے بھی زیادہ جگمگاتے ہوئے قمقموں کی جھالریں جھول رہی تھیں۔ سنگِ مرمر کے ہر ستون پر بجلی کے تار کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور اس میں پکے ہوئے انگوروں کی طرح لال، ہرے نیلے پیلے بلب لگے ہوئے تھے۔ سارے گھر میں کچھ نہیں تو دس ہزار بجلی کے یہ دیئے شام سے ہی دیوالی کا اعلان کر رہے تھے۔ دیوی لکشمی کا انتظار کر رہے تھے۔

مگر ان سب میں سب سے زیادہ نمایاں وہ ایک ہی دیا تھا۔ دیوی کا سمراٹ جو اپنی روشنی سے شام کے دھندلکے کو دوپہر کی طرح روشن کئے ہوئے تھا۔ یہ دیا سیٹھ لکشمی داس امریکہ سے لائے تھے۔

جب وہ وہاں اپنی کمپنی کے لیے بجلی کا سامان خریدنے گئے تھے ـــــ دراصل یہ دیوی کا سمراٹ انھیں ذاتی کمیشن کے طور پر بھینٹ کیا گیا تھا۔ مال سپلائی والی امریکن الیکٹرک کمپنی کی طرف سے۔ اور اس کو دیکھتے ہی سیٹھ لکشمی داس نے سوچ لیا تھا کہ اب کے بار دیوالی پر یہ امریکن دیا ہی دیوی لکشمی کا سواگت کرے گا۔

اور آج شام ہی سے یہ دیا اپنی بھڑکیلی امریکن شان سے جل رہا تھا۔ اُس کے چاروں طرف دس ہزار اور روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سیٹھ لکشمی داس کا کہنا تھا کہ سب تہواروں میں دیوالی ہی سب سے اہم اور برتر تہوار ہے۔ دیوالی کی رات کو جہاں اس کا سواگت کرنے کو روشنیاں ہوتی ہیں وہاں دیوی لکشمی آتی ہے۔ سو وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ ہر دوسرے سیٹھ اور بیوپاری کے گھر سے زیادہ روشنیاں لکشمی محل میں ہونی چاہئیں۔ اُن کو یقین تھا کہ جتنی روشنیاں زیادہ ہوں گی اُتنی ہی زیادہ لکشمی دیوی کی مہربانی بھی ہوگی اور شاید تھا بھی یہ سچ۔ بیس بائیس برس پہلے جب ان کی چھوٹی کپڑے کی دوکان تھی تب ان کے گھر میں کڑوے تیل کے سو دیئے جلا کرتے تھے۔ پھر جب جنگ ہوئی اور ان کو فوجی کمبل سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تو اُن کے نئے گھر پر ایک ہزار دیئے جگمگانے لگے۔ پھر جب آزادی آئی، اور سیٹھ لکشمی داس کو ایک بہت بڑے ڈیم بنانے کے لئے مزدور سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تو دیوالی کی رات کو اُن کے بنگلے پر پانچ ہزار بجلی کے بلب جگمگا اُٹھے اور اس سال جب کہ انہوں نے ایک امریکن کمپنی کے ساتھ مل کر نئی کروڑ روپے کا کارخانہ قائم کر لیا تھا جس میں انھیں لاکھوں روپے مہینے کی آمدنی کی اُمید تھی، اگر انکم ٹیکس افسر کوئی گڑبڑ نہ کرے۔

اس مرتبہ تو انھوں نے اپنے لکشمی محل میں ایسی روشنی کی تھی کہ ایک بار تو دیوی لکشمی کی آنکھیں بھی چکا چوند ہو جائیں۔ اتنی بہت روشنیاں اور خصوصاً امریکن دیوی کے سمراٹ کو دیکھ کر دیوی خوش ہو گئی تو کون جانتا ہے اگلی دیوالی تک سیٹھ جی پانچ چھ اور کارخانے اور دو چار بینک خریدنے کے قابل ہو جائیں۔

ہاں تو دیوالی کی رات تھی اور سیٹھ صاحب الیکٹرک انجینیر کو ہدایت دے رہے تھے کہ بجلی کے کنکشن اور فیوز وغیرہ کا خاص خیال رکھے کیوں کہ کسی کی بھول سے ایک سیکنڈ کے لئے بھی بجلی فیل ہو کر اندھیرا ہو گیا تو خطرہ ہے کہ دیوی لکشمی ناخوش ہو کر اس گھر سے ہمیشہ کے لئے نہ چلی جائے۔ اس لئے الیکٹرک انجینیر نے ایک جنریٹر بھی لگایا ہوا تھا تاکہ پاور کے کرنٹ میں کوئی گڑبڑ ہو تو جنریٹر سے بنائی ہوئی بجلی کام آئے۔

یکایک سیٹھ صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے محل بھر میں لگے ہوئے سارے بجلی کے قمقموں کی روشنی اور تیز ہو گئی ہو ـــــ "دیوی لکشمی آ گئی" انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ مگر انجینیر نے سمجھایا کہ کرنٹ کے گھٹنے بڑھنے سے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روشنی زیادہ یا کم ہو جاتی ہے۔

"تو پھر تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ دیکھتے رہو کہ روشنی زیادہ ہوتی رہے۔ ایک پل کے لئے بھی کم نہ ہو۔"
یہ کہہ کر سیٹھ صاحب برآمدے کی سنگِ مرمر کی سیڑھیاں اُتر کر باغ کی طرف آرہے تھے جہاں ہر پیڑ کی شاخوں میں جگمگاتے ہوئے "پھل" جھول رہے تھے۔ کہ انھوں نے ایک عورت کو سڑک پر کھڑا دیکھا ____
عورت گاؤں سے آئی لگتی تھی۔ اس کے بدن پر میلا گھاگرا تھا۔ جس کا رنگ کبھی لال رہا ہوگا اسی رنگ کی چولی تھی اور سر پر اوڑھنی تھی۔ وہ بھی موٹے لال کھدر کی مگر چھپی ہوئی۔ اپنے سر پر وہ میلے کچیلے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری اٹھائے ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے نہ صرف میلے تھے بلکہ پھٹے پرانے پیوند بھی لگے تھے۔
"کوئی غریب بھکارن ہوگی۔" سیٹھ لکشمی داس نے دل میں سوچا۔
"کیوں مائی کیا چاہیئے؟" انھوں نے سیڑھیاں اُترتے پوچھا اور قریب جانے پر انھوں نے دیکھا کہ عورت غریب ہی مگر جوان ہے اور رنگت سانولی ہونے پر بھی خوبصورت ہے۔
"ایک رات کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیئے، سیٹھ جی بڑی دور سے آئی ہوں۔"
"نا بابا معاف کرو" وہ جلدی سے بولے۔ من ہی من میں انھوں نے سوچ لیا تھا کہ ایک انجانی غریب جوان عورت کو رات بھر کے لئے گھر میں رکھنے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے راتوں رات گھر میں سے روپیہ پیسہ یا زیور سونا چُرا کر بھاگ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے بلیک میل کر کے روپیہ وصول کرے۔ سیٹھ جی کا لڑکا جوان تھا۔ وہ کہیں اس انجانی عورت کے چکر میں نہ آجائے۔
پھر بھی انھوں نے سوچا دیوالی کی رات ہے۔ کسی بھکارن کو دھتکارنا بھی نہیں چاہیئے ____
"بھوکی ہو تو کھانا کھلوائے دیتا ہوں۔ لڈو، پوری جو جی چاہے کھاؤ۔"
"میں بھکارن نہیں ہوں سیٹھ جی۔"
اس نے اپنے سر پر دھری ہوئی گٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے پاس کھانے کو بہت کچھ ہے۔ مکئی کی روٹی ہے، چنے کا ساگ۔ گاؤں کا اصلی گھی ہے۔ دہی ہے، دودھ ہے۔ آپ کے سارے گھر کو پیٹ بھر کے کھلا سکتی ہوں۔ مجھے تو رات بھر ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیئے۔"
اس کی حاضر جوابی سے سیٹھ جی اور گھبرا گئے۔ انھوں نے سوچا ایک معمولی گاؤں کی عورت کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ یوں سوال جواب کرے۔ کہیں یہ عورت انکم ٹیکس والوں کی سی آئی ڈی تو نہیں ہے؟"
"نا بابا معاف کرو، ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ کوئی دوسرا گھر دیکھو۔"
"تو پھر دوسرا ہی گھر دیکھنا پڑے گا سیٹھ جی۔" یہ کہا اور وہ عورت اپنی گٹھری سنبھالتی ہوئی چلی گئی۔
سیٹھ جی مڑ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے واپس برآمدے میں جا رہے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس امریکن دیئے کی روشنی کچھ پیلی پڑتی جا رہی ہے۔ "یہ پاور ہاؤس کا کرنٹ پھر نیچے جا رہا ہے" اور پھر

چلّا کر کہا۔ "انجینیر جنریٹر تیار رکھو۔ دیئے بجھنے نہ پائیں۔ الیکٹرک انجینیر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا:
"سیٹھ جی کرنٹ بالکل ٹھیک آرہا ہے۔ ویسے جنریٹر بھی تیار ہے۔ آپ بالکل نہ گھبرائیے۔"
"گھبراؤں کیسے نہیں؟" سیٹھ جی کا دل نہ جانے کیوں ایک عجیب بے چینی سے دھڑک رہا تھا۔ جانتے نہیں دیوالی کی رات ہے؟ ایک پل کو بھی اندھیرا ہوگیا اور وہی دیوی کے آنے کا سمے ہوا اور دیوی روٹھ کر کہیں اور چلی گئی ___ تو ___ تو ___؟

## دوسرا دیا:۔

انکم ٹیکس افسر لکشمی کانت تیل کی بوتل لے کر اپنے فلیٹ کی بالکنی میں نکلا تو اس نے دیکھا کہ سامنے سیٹھ لکشمی داس کا محل بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔

"ہاں کیوں نہ ہو!" اس نے سوچا کروڑوں روپیہ بلیک کا جو موجود رکھا ہے۔ دس ہزار کیا دس لاکھ بجلی کے بلب لگا سکتا ہے۔"

پھر اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی بالکنی کی منڈیر پر جو سو دیئے اس نے سجا رکھے ہیں، اُن میں سے ایک دیئے کی لَو دھیمی ہوئی جا رہی ہے۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔ "کہیں دیا بجھ نہ جائے، شگون ہی بُرا نہ ہو جائے!" اور جلدی سے اس نے بوتل کا تیل دیئے میں اُلٹ دیا۔ دیا سلائی سے لو بھی اُوپر کی تو اُسے ایسا لگا کہ نہ صرف اس دیئے کی بلکہ سو کے سو دیئوں کی روشنی ایک دم سے تیز ہوگئی۔

دھنیہ ہو، دیوی" اُس نے دیوار پر لکشمی کی تصویر کے آگے پرنام کرتے ہوئے کہا "اِس برس تو تمہاری بڑی کرپا رہی ہے۔"

پھر اُس نے کرسی پر آرام سے بیٹھ کر اپنا جاسوسی ناول اٹھایا جو ختم کے قریب تھا اور جس کا ہیرو اس وقت ڈاکوؤں کی سنہری لوٹی کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو رسوئی میں سے اس کی بیوی چلائی "اجی او ___ ذرا دیکھنا تو کون ہے؟"
"منگو سے کہو نا دیکھے کون ہے" اس نے ناول سے نظر اُٹھائے بغیر جواب دیا۔
"منگو کو میں نے بازار بھیجا ہے، مٹھائی لانے" رسوئی سے آواز آئی۔
"تو گنگا کو بھیجو!" گنگا اُن کے یہاں برتن مانجھنے پر ملازم تھی اور صبح شام کام کرنے آتی تھی۔
"گنگا مُردار تو آج چھٹی منا رہی ہے۔ کہتی تھی بائی ہماری بھی آج دیوالی ہے۔ آج ہم کام نہیں کریں گا۔ سو میں نے بھی چڑیل کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔
گھنٹی ایک بار پھر بجی۔
"اچھا، اب تم ہی اُٹھ جاؤ نا ___ ضرور سیٹھ جی کے ہاں سے مٹھائی آئی ہوگی۔"
"کیا صرف مٹھائی ہی آئی ہے یا کچھ اور؟" اُس نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

مگر جب اس نے دروازہ کھولا تو سیٹھ جی کا ملازم نہیں ہے۔ ایک عورت کھڑی ہے۔ عورت صورت سے گنوار لگتی تھی۔ کپڑے بھی پھٹے پرانے تھے۔ سر پر ایک میلے سے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری تھی مگر تھی جوان اور خوبصورت، لکشمی کانت نے دل ہی میں سوچا۔ جوانی اور خوبصورتی پر بھی انکم ٹیکس لگنا چاہیئے۔

مگر اُونچی آواز سے اس نے پوچھا "کیوں، کیا چاہیئے؟"

"بابو جی! بڑی دور سے آئی ہوں۔ گھر لوٹنے کا سکت نہیں رہا۔ ایک رات کو ٹھیرنے کا ٹھکانہ مل جاتے تو بڑی کرپا ہوگی۔ میں کہیں کونے میں پڑ رہوں گی۔"

لکشمی کانت نے ایک بار پھر اس عورت کی جوانی کا جائزہ لیا پھر مڑ کر کن آنکھیوں سے رسوئی کی طرف دیکھا جہاں اس کی بیوی بیٹھی پوریاں تل رہی تھی۔ لاجو موٹی تھی۔ اس کے منہ پر چیچک کے نشان تھے مگر وہ جہیز میں دس ہزار نقد لائی تھی۔ اس کے سب رشتہ داروں نے مبارکباد دے کر کہا تھا۔ لکشمی کانت سچ مچ تیرے گھر میں تو لکشمی آئی ہے۔

لکشمی کانت نے اپنی بیوی کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں پوریاں بیلنے کے لیے جو لکڑی کا بیلن تھا، اور پھر ہلکی سی ٹھنڈی سی سانس لے کر اس انجانی عورت کی طرف مخاطب ہوا:

"آئی کہاں سے ہو؟"

"بڑی دُور سے آئی ہوں بابو جی، مگر اس وقت تو سیٹھ لکشمی داس کے ہاں سے آئی ہوں۔"

"کیوں سیٹھ جی نے تمہیں نکال دیا...؟"

"ہاں بابو جی، یہی مجھے نکال ہی دیا۔"

"اور وہاں سے تم سیدھی یہاں چلی آئیں۔"

"ہاں بابو جی!"

لکشمی کانت نے کتنے ہی جاسوسی ناول پڑھے تھے اور اُسے معلوم تھا کہ اگر کوئی سرمایہ دار کسی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا ہتھیار کوئی ایسی عورت بھی ہو سکتی ہے۔

"تو سیٹھ جی نے مجھے یہ دیوالی کی بھینٹ بھیجی ہے؟" اس نے دانت بھینچ کر کہا۔

"اس گٹھری میں کیا ہے؟"

"اس میں مکئی کی روٹی ہے بابو جی، چنے کا ساگ ہے اور گاؤں کا اصلی گھی ہے اور دُودھ ہے۔ دہی ہے۔"

"بس بس رہنے دو۔" اُسے یقین تھا کہ یہ سب بکواس ہے۔ جاسوسی ناولوں کے مطابق اس گٹھری میں زیور ہوگا۔ نشان لگے ہوئے نوٹ ہوں گے۔ رات کو یہ گٹھری اس گھر میں چھوڑ کر یہ عورت چمپت

ہو جائے گی اور جب سیٹھ اس کو پکڑوانے کی دھمکی دے گا تو بغیر کچھ لئے دیئے اس کے انکم ٹیکس کے ریٹرن پاس کرنے ہوں گے۔

"جاؤ دوسرا گھر دیکھو" اس نے عورت کی جوانی کا آخری بار جائزہ لینے کے بعد ایک اور ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر دیا۔

"کون تھا؟" لاجو رسوئی سے چلائی۔

"کوئی نہیں۔"

"کوئی نہیں تھا تو اتنی دیر کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

"میرا دماغ مت کھاؤ۔ کوئی بھکارن تھی۔"

بھکارن تھی تب ہی اتنی دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے، میں تمہیں خوب.....

ایک بار پھر گھنٹی بجی۔

دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"جاؤ لگتا ہے پھر تمہاری بھکارن آئی ہے" بیوی نے حکم دیا۔

لکشمی کانت نے دروازہ کھولا تو سفید وردی پہنے ایک ڈرائیور ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا سنہری ڈبہ لئے کھڑا تھا۔

"سیٹھ لکشمی داس نے دیوالی کی مٹھائی بھیجی ہے۔"

لکشمی کانت ڈبہ لے کر اندر آیا تو لاجو نے جلدی سے ڈبہ لے لیا اور ڈرائیور سے چلا کر بولی "اچھا بھائی سیٹھ جی سے ہمارا نمستے کہنا اور دیوالی کی مبارکباد۔

دروازہ بند کر کے لکشمی کانت کمرے میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ بیوی نے پھر ڈانٹا۔ "ارے یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جلدی سے دیوں میں تیل ڈالو۔ اُن کی روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔

## تیسرا دیا:-

دیا صرف ایک تھا جو جھونپڑی کے سامنے ٹمٹما رہا تھا۔ دیئے میں تیل بھی بہت کم تھا۔

اندر کھاٹ پر لکھو پڑا تھا۔ اس کا نام کبھی لکشمی چند ہوتا تھا۔ جب وہ اپنے گاؤں سے چل کر شہر آیا تھا مگر مل میں اور جھونپڑیوں کی بستی میں اُسے لکھو ہی لکھو کہتے تھے۔ غریب مزدور کو اور خصوصاً جب وہ بے کار ہو اور بیمار بھی ہو، بھلا کون لکشمی چند کہہ سکتا تھا۔

اُس کی بیوی گنگا ایک کونے میں بنے ہوئے چولہے پر بھات پکا رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی کہ بچوں کو بھات کے ساتھ ساتھ کھانے کو کیا دوں۔ بارہ آنے گھر میں تھے۔ اس کی وہ لکھو کی دوا لے آئی تھی۔ مالکن نے کھڑے کھڑے نکال دیا تھا۔ صرف اس لئے کہ اُس نے دیوالی کی چھٹی مانگی تھی۔ پندرہ دن کی پگار باقی

تھی وہ بھی نہیں دی تھی۔ کہہ دیا تھا "دیوالی کے بعد آنا، آج کے دن ہم لکشمی کو گھر سے باہر نہیں نکالتے"۔ اتنے میں اُس کے دونوں بچے باہر سے بھاگتے ہوتے آئے۔ بڑا سات برس کا تھا لچھمن، اور چھوٹی چار برس کی تھی مینا۔

لچھمن بولا "ماں، ماں سیٹھ جی کے محل میں اِتے دیئے جل رہے ہیں کہ لگتا ہے رات نہیں دن ہے اور ایک دیا تو اِتا بڑا ہے کہ سب اُسے دیوی کا سمراٹ بولتے ہیں"۔

اور مینا نے بھنک کر کہا "ماں بھوک لگی ہے"۔

مگر لچھمن نے اُسے ڈانٹ دیا۔ "میں کہتا ہوں ماں ہمارے ہاں ایک ہی دیا کیوں جل رہا ہے؟ اِس لئے بیٹا کہ ہم غریب ہیں۔ تیل کے پیسے نہیں کہ اور دیئے جلا سکیں"۔

اور کھانستے ہوئے لکھو نے کھاٹ پر سے آواز دی "اری تو پھر یہ دیا بھی بجھا دے۔ اِس جھونپڑی میں اندھیرا ہی ٹھیک ہے"۔

"ہائے رام" گنگا جلدی سے بولی ـــ دیوالی کی رات کو دیا بجھا دوں؟ اندھیرے میں دیوی لکشمی نہیں آئے گی۔"

لکھو اتنی زور سے چلایا کہ پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ مگر کھانستے کھانستے بھی وہ بولتا گیا "دیوی سیٹھ لکشمی داس کے محل میں جائے گی۔ لکشمی چند کے گھر نہیں آئے گی ـــ نہ بجھا چراغ ـــ تھوڑی دیر میں تیل ختم ہو جائے گا تو آپ سے آپ ہی بجھ جائے گا۔"

لچھمن جو کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا چلایا ـــ "بابا۔ بابا۔ دیکھو ہمارے دیئے کی لَو آپ سے آپ اُونچی ہوتی جا رہی ہے۔"

"پاگل ہوا ہے بے" لکھو اُسے ڈانٹ ہی رہا تھا کہ یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گیا کہ باہر رکھے ہوتے دیئے کی روشنی اب جھونپڑی میں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔

دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔

گنگا نے دروازہ کھولا تو دیئے کی روشنی میں دیکھا، ایک عورت کھڑی ہے۔

"کیا ہے بہن؟"

"ایک رات کہیں ٹھیرنے کا ٹھکانہ چاہیئے۔ بڑی دُور سے آئی ہوں۔"

"تو اندر آ جا نا۔"

وہ عورت دروازہ میں سے اندر آئی تو اس کے ساتھ ہی چراغ کی روشنی بھی اندر آ گئی۔

لکھو نے کہا "ہمارے پاس تو بس یہی جھونپڑی ہے۔ ہوئی تو تکلیف، مگر اتنی رات گئے اور کہاں جاؤ گی۔ کھاٹ بھی ایک ہی ہے مگر میں اپنا بستر اُدھر زمین پر کر لوں گا۔"

عورت زمین پر بڑے آرام سے کھیسکڑا مار کر بیٹھ گئی تھی۔ "نہیں بھائی، تم بیمار ہو۔ تم کھاٹ پر سوؤ۔ میں تو دھرتی ہی سے نکلی ہوں۔ دھرتی ہی سے مجھے سُکھ آرام ملتا ہے۔"

گنگا نے کہا " لگتا ہے شہر میں پہلی بار آئی ہو۔ کہو دیوالی کی روشنیاں دیکھیں؟"

"ہاں۔" عورت نے تھکی ہوئی سی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا " دیوالی کی روشنیاں بھی دیکھیں، دیوالی کا اندھیرا بھی دیکھا۔"

گنگا اس کا مطلب نہ سمجھی۔ لکھو بھی کھاٹ پر پڑا سوچتا رہا۔ یہ عورت تو کوئی بڑی ہی انوکھی باتیں کرتی ہے اور اُس نے دفعتاً محسوس کیا کہ جیسے اس کی چھاتی پر سے کھانسی کا بوجھ آپ سے آپ اُتر گیا ہو وہ جو سات دن سے کھاٹ پر پڑا تھا، بے سہارا اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا "گنگا آج تو مجھے بھی بھوک لگی ہے نکال کھانا مہمان کے لئے بھی۔"

گنگا نے ہانڈی چولھے پر سے اُتارتے ہوئے شرمندہ ہو کر کہا " بھات تو ہے مگر ساتھ کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ نہ جانے تم سُوکھا بھات کھا بھی سکو گی بہن؟"

" تم میری فکر نہ کرو۔" عورت نے اپنی گٹھڑی سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

" میرے پاس سب کچھ ہے۔ دراصل یہ میں تمہارے لئے ہی لائی تھی۔"

" ہمارے لئے؟ پر تم تو ہمیں جانتی ہی نہیں تھیں۔"

" میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں بہن۔ لکھو بھائی کو بھی، لچھمن اور مینا کو بھی۔"

یہ کہہ کر اُس نے گٹھڑی کھولی تو کھانے کی خوشبو سونگ کر بچے اُس کے پاس آ گئے۔

" اس میں کیا ہے؟ لکھو نے کھاٹ سے اُتر کر چولھے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

عورت نے ایک ایک چیز نکال کر اُن کے سامنے رکھ دی۔

" یہ ہیں مکئی کی روٹیاں مکھن لگی ہوئی۔ یہ ہے چنے کا ساگ، یہ ہے گاؤں کا اصلی گھی، یہ ہے دیوالی کی مٹھائی۔ اصلی کھوئے کے پیڑے۔ یہ ہے دہی، اور اِس لُٹیا میں بچوں کے لئے گائے کا دودھ ہے۔ شہر کی طرح پانی مِلا نہیں ہے۔"

اور یہ سُن کر سب ہنس پڑے۔ مگر اتنا بہت کھانا دیکھ کر لکھو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ روٹی کا لقمہ بناتے ہوئے بولا " یہ سب ہو تو پھر آدمی کو اور کیا چاہیئے؟"

وہ کھانا کھاتے جا رہے تھے اور اس انجانی عورت کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے جا رہے تھے۔ جو نہ جانے کہاں سے اُن کے لئے یہ ساری نعمتیں لے کر آ گئی تھی۔

کھانا کھا کر وہ سب آرام سے بیٹھے تب گنگا نے کہا " بہن آج تمہاری بدولت ہماری دیوالی ہو گئی۔"

اور لکھو ہنس کر بولا " نہیں تو دیوالہ ہی دیوالہ تھا۔ تمہارا شکریہ کیسے ادا کریں بہن۔ ہمیں تو تمہارا

پُوجا کرنی چاہیئے۔"

اور عورت نے کہا "شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیئے۔ میں اس سارے شہر میں پھری مگر کسی نے مجھے رات بھر کے لئے آسرا نہیں دیا۔ سوائے تمہارے سب محلوں کے سب بنگلوں کے دروازے بند تھے۔ میرے لئے کھلا تھا تو صرف تمہاری جھونپڑی کا دروازہ۔ اب میں ہر برس تمہارے ہاں آیا کروں گی دیوالی پر۔"

گنگا نے کہا۔ "بہن تم کل سویرے چلی جاؤ گی تو ہم تمہیں یاد کیسے کریں گے؟ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو؟"

اور اس کا جواب سن کر وہ سب بڑی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اس عورت نے کہا۔ "میں یہیں تم لوگوں کے پاس رہتی ہوں ——— میں اِن کھیتوں کے پاس رہتی ہوں جہاں لکھو بھیّا کے بابا اناج اُگایا کرتے تھے اور میں اس کارخانے میں بھی رہتی ہوں جہاں لکھو بھیّا مشینوں سے کپڑا بنتے ہیں۔ جہاں کہیں انسان اپنی محنت سے اپنی ضروریات پیدا کرتا ہے۔ میں وہیں رہتی ہوں اور دیوالی کی رات کو میں ہر اُس گھر میں پہنچ جاتی ہوں۔ جہاں ایک چراغ میں بھی مجھے اِنسانیت اور سچی محبت جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔"

تھوڑی دیر جھونپڑی میں سناٹا رہا۔ اب اس اکلوتے ننھے سے دیئے کی روشنی اتنی تیز ہو گئی تھی کہ جھونپڑی کا کونا کونا جگمگا اٹھا تھا اور دور سیٹھ لکشمی داس کے محل میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ شاید کرنٹ اور جنریٹر دونوں فیل ہو گئے تھے اور بابو لکشمی کانت کی بالکنی کے سارے دیئے بھی تیل ختم ہو کر بجھ گئے تھے۔

دیوی!" گنگا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

اور اس عورت نے مسکرا کر جواب دیا "لکشمی۔"


مطالعے کے شوقین متوجہ ہوں

اگر آپ مطالعے کے شوقین ہیں اور آپ کو کتب و رسائل ملنے میں دشواری ہوتی ہے تو ہم سے رابطہ قائم کریں ہم کوشش کرکے آپ کی مطلوب کتاب یا رسالہ مہیا کریں گے۔ یہ پیشکش اندرون و بیرون ملک دونوں قارئین کے لیے ہے۔ اندرون ملک قارئین جوابی لفافہ ضرور بھیجیں۔ نوٹ: کسی قسم کی نقد رقم لفافے میں ڈال کر ہرگز نہ بھیجیے

شفیق بک بنک اینڈ سبسکرپشن ایجنسی

فہیم روڈ O نیا محلہ ——— O

# بنارس کا ٹھگ

(۱)

ریل کے اسٹیشن پر لکھا تھا ——— وارانسی ( VARANASI )
پولیس کے تھانے کے باہر لکھا تھا ——— وارانسی ———
ہسپتال کے دروازے پر بورڈ لگا تھا ——— وارانسی
شراب کی دکان پر لکھا تھا ——— وارانسی ———
افیون گانجہ اور چرس کی دوکان پر لکھا تھا ——— وارانسی
کتابوں کی دوکان پر، جہاں کوک شاستر کھلے عام بک رہی تھی، لکھا تھا وارانسی ——— اوشدھالیہ پر، جہاں سدھ مکر دھوج خریدنے کے لئے بھیڑ لگی تھی، لکھا تھا ——— وارانسی ——— حکیم حاذق الملک کے دار الشفا پر لکھا تھا ——— وارانسی
پنجرا پول پر لکھا تھا ——— وارانسی
گئو شالہ پر لکھا تھا ——— وارانسی
پاگل خانہ پر بورڈ لگا تھا ——— وارانسی
اور ڈاک خانہ میں چھٹیوں پر کھٹا کھٹ مہریں لگائی جارہی تھیں ——— وارانسی ——— وارانسی ——— وارانسی ——— جیسے ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی ہے۔ جیسے طبلے پر تھاپ پڑتی ہے وارانسی۔ وارانسی

وارانسی ۔ وارانسی ۔

مگر جب مسافر نے راہ گیر سے پوچھا ۔ "بھائی یہ کونسا شہر ہے؟" تو جواب ملا ۔ ۔ ۔ ۔

"بنارس"

اور مسافر جواب تک حیران و پریشان، کھویا کھویا ہوا گھوم رہا تھا، یک بیک اُس کے چہرے پر ایک عجیب خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں نہ جانے کتنی پرانی یادیں جاگ اُٹھیں۔ اُس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب معصوم مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے بچہ گھر آکر ماں سے کہہ رہا ہو ——— ماں، میں آگیا۔"

مسافر بہت دُور سے آیا تھا ——— مگر اُس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اُس کے گھر کے دھلے گاڑھے کے کپڑوں پر راستے کی کوئی گرد نہیں تھی۔ اس کے پاس نہ بستر تھا، نہ ٹرنک، نہ ناشتہ دان، نہ صُراحی، نہ پانی کا لوٹا، نہ پانی کی لٹیا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ اُٹھا کر چل رہا ہے۔

مسافر کو ٹھہرنے کے لئے جگہ چاہئے تھی۔ راستے میں اُس نے کسی راہ چلتے سے پوچھا ۔ "بھائی یہاں بھولی بھٹیارن کی ایک سرائے ہوا کرتی تھی"

جواب ملا ۔ "سرائے تو یہاں کوئی نہیں ۔ البتہ ایک مسلم مسافر خانہ ہے"

"اور جو مسلمان نہ ہوں وہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟"

"ہندوؤں کے لئے کئی دھرم شالائیں ہیں"

"اور جو نہ ہندو ہوں، نہ مسلم ہوں؟"

راہ گیر نے ایک ہوٹل کی طرف اشارہ کر دیا۔

باہر بورڈ لگا تھا، جس پر لکھا تھا ۔ "ہوٹل وارانسی ۔ وارانسی" اور مسافر یہ سوچتا ہوا اندر داخل ہو رہی رہا تھا کہ آخر یہ وارانسی دوبارہ کیوں لکھا گیا ہے، کہ اُس نے دیکھا کہ ایک کالا ناگ پھن پھیلائے اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گھبرا کر وہ ایک طرف کو ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ ایک آدھ ننگی جوان فرنگی عورت کھڑی ہے اور اُس کے گلے اور سینے اور کولھوں کے گرد ایک بھیانک اژدہا لپٹا ہوا ہے اور ایک داڑھی والا مداری کھڑا کہہ رہا ہے ——— "پائی تھن میم صاحب۔ پائی تھن ۔ نو میک فیر۔ میم صاحب۔ ٹیک پکچر۔ اونلی ٹو روپی"۔ اور مسافر جو یہ بھاشا نہیں سمجھتا تھا سمجھا کہ یہ سپیرا اس فرنگی عورت کو اژدہے سے ڈسوا رہا ہے۔ اور اس نے لپک کر اژدہے کو دونوں ہاتھوں سے کھینچا اور زور سے زمین پر پٹخ دیا۔

فرنگی عورت اپنی بھاشا میں کچھ چلائی۔

سپیرے نے مسافر کو گردن سے پکڑ لیا ۔ "اے بڈھے، یہ کیا کرتا ہے؟ میرا کام خراب کر دیا"

اور پھر اس کی آنکھوں میں ایک شبہ کی چمک آئی۔ "اے تو بھی سپیرا ہے کیا؟"
مسافر نے کہا — "میں سپیرا نہیں ہوں۔ پر تو یہ کیا کر رہا تھا وہ بے چاری فرنگی عورت مر جاتی تو؟"
"ارے مُورکھ اژدہے کے دانت نہیں ہیں۔ اس کو گلے میں ڈال کر میم صاحب تو صرف تصویر کھنچوا رہی تھی۔ چل اپنا راستہ لے۔ پاگل کہیں کا" اور پھر اُس نے فرنگی عورت کی طرف دیکھ کر اُنگلی سے اپنی کھوپڑی کی طرف اشارہ کیا اور بولا "میم صاحب، اولڈ مین، اسکرو لوز، نو مائنڈ، پاگل مین ناؤ پائی تھن میک لو میم صاحب۔ صاحب ٹیک پکچر۔ اونلی ٹو روپی"۔
اور اب مسافر ہوٹل کے منیجر سے بات کر رہا تھا۔
"کیا میں اس سرائے میں ٹھہر سکتا ہوں؟"
"یہ سرائے نہیں ہوٹل ہے!"
"اچھا تو اب سرائے کو ہوٹل کہتے ہیں۔ میں یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں"۔
"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"
"جی میں تو یہیں رہتا ہوں، اور یہاں سے اتنی دُور بھی رہتا ہوں کہ کوئی اِس فاصلہ کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔"
منیجر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ پھر اس نے اپنے رجسٹر میں لکھے ہوئے سوالوں پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ آپ نے سفر کیسے کیا؟ مطلب یہ کہ آپ یہاں آتے کیسے؟ ریل سے؟"
"جی نہیں!"
"بس سے؟"
"جی نہیں!"
ہوائی جہاز سے؟"
"جی نہیں — یا یوں سمجھیے، جی ہاں — آپ میرے سفر کو ہوائی جہاز کا سفر کہہ سکتے ہیں!"
"آپ کا سامان کہاں ہے؟"
"جی سامان — جہاں میں رہتا ہوں وہاں کسی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی!"
"تو آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتے!"
"تم اس سرائے کے، یعنی ہوٹل کے۔ مالک ہو کیا؟"
"نہیں منیجر ہوں!"
"تو مالک کون ہے؟"
"اس کے مالک ہیں بھگوان کاشی دوار کا ناتھ بھنجم"

"تو اس کو ہوٹل ووٹل کیا کہتے ہیں ــــ یہ تو بھگوان کا مندر ہوا۔ اور مندر میں کوئی بھی مسافر بھگوان کا مہمان ہو سکتا ہے۔"

مینجر ہنس کر بولا ــــ مگر جو دیوتا اس ہوٹل کا مالک ہے، وہ کرایہ مانگتا ہے۔ ہر کمرے کا چالیس روپیہ روز کرایہ۔ اتنا روپیہ ہے تمہارے پاس؟" اور مسافر غصّے سے بولا ــــ "تو پھر اس جگہ کا مالک بھگوان نہیں کوئی شیطان ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ میں جاتا ہوں!"

اور یہ کہہ کر وہ وہاں سے جلدی جلدی قدم بڑھاتا چلا گیا اور اُس کے جانے کے بعد مینجر نے بیرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیسے کیسے پاگلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔"

اور بیرے نے کہا ــــ "صاحب، یہ تو کوئی خطرناک پاگل ہے۔ ابھی میں نے دیکھا وہ امریکن میم صاحب کو تنگ کر رہا تھا۔ وہ اپنا ہیرا ہے نا، اُس کا ناگ چھین کر بھاگنے والا تھا۔"

"تو پہلے کیوں نہیں بولا۔ ایسا پاگل لوگ ہمارے ہوٹل کے آس پاس گھومے گا تو ٹورسٹ لوگ اِدھر آنا بند کر دے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور ڈائل گھمایا۔ ۸-۶-۰-۰-۴-

(۴)

اور اب مسافر بازار کی بھیڑ میں سے چلا جا رہا تھا۔ اُس نے سوچا میرے زمانے میں تو آبادی اتنی نہیں تھی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اپنے شہر میں اتنی رونق ہے۔ راستے میں اس نے بنارسی ساڑھیوں، اور کمخواب کی دوکانیں دیکھیں۔ اُس نے سوچا کیا نفیس کپڑا آج بھی ہمارے کرگھوں پر بُنا جا رہا ہے ــــ دوکانیں رنگ برنگی ساڑھیوں اور مختلف قسم کے تھانوں سے اَٹی پڑی تھیں۔ اس نے سوچا، اب تو اپنے شہر کی ہر عورت بنارسی ساڑی پہن سکتی ہے۔ کمخواب کا لہنگا یا پاجامہ سلوا سکتی ہے۔ دوسری دوکانوں پر اُس نے دیکھا کہ ہر قسم کا اُونی کپڑا ابھی بھرا پڑا ہے۔ اُس نے سوچا جاڑے کا انتظام اچھا ہے۔ یہ سب ترقی کے آثار ہیں۔ ورنہ ہمارے زمانہ میں تو اس موسم میں روئی کے دگلے پہنے جاتے تھے۔

مگر جب اس نے بازار کی طرف رُخ کیا اور چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا تو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سب پھٹے پُرانے، میلے کپڑے پہنے کیوں گھوم رہے ہیں۔ دوکانوں میں کئی لاکھ بنارسی ساڑھیوں کا ڈھیر ہے اور سڑک پر کھڑی بھکارن ایک چیتھڑے میں اپنا اور اپنے بچے دونوں کا بدن کو ڈھانکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہاتھ گاڑی کو ڈھکیلتے ہوئے دو دُبلے دُبلے مزدور جا رہے ہیں اور اُن کے بدن پر پھٹے ہوئے سُوتی کُرتوں اور میلی دھوتیوں کے سوا کچھ نہیں اور وہیں قریب کی دوکان پر ایک لالہ جی پشمینے کا دوشالہ پہنے انگیٹھی پر ہاتھ سینک رہے ہیں اور ایک مولوی صاحب کشمیری سنہری کام کا اونی چوغہ پہنے سر پر بیس گز کا عمامہ باندھے مسجد کی طرف جا رہے ہیں اور ایک داڑھی

مونچھ منڈا نوجوان اُونی ولایتی سوٹ اور کوٹ، اُونی موزے مغلر اور دستانے پہنے منھ سے دُھواں نکالتا اپنی موٹر کی طرف جا رہا ہے۔ ایک لمبی چوڑی موٹر جس پر جھنڈا لگا تھا، قریب سے گذر گئی اور مسافر کو اس میں صرف ایک سفید ٹوپی کی جھلک نظر آئی اور پاس کھڑے ہوئے کسی راہ گیر نے کہا "دیکھا تم نے چاروں طرف شیشے چڑھے ہوئے ہیں کہ کہیں منتری جی کو چھینک نہ آجائے"۔

اور پھر ایک اُس سے بھی لمبی موٹر آئی اور ایک ساڑھیوں کی دکان پر رُکی اور اُس میں سے اُتر کر ایک موٹا تازہ آدمی اندر آگیا اور اُس کی کالی کالی انگلیوں پر انگوٹھیوں کے ہیرے ایسے چمکے جیسے رات کے وقت گندی نالی کے بدبودار پانی میں ستاروں کا عکس جھلملاتا ہے۔ کسی نے کہا۔ "پہچانا تم نے، یہ ہیں سیٹھ لروڑی مل بچوڑی مل کالے بازار میں انہوں نے ایک کروڑ کمایا ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ کا مندر بنایا ہے اور اب اپنی پتری کو پانچ لاکھ کا جہیز دینے والے ہیں۔ اس کے لئے ساڑھیاں خرید نے آتے ہیں۔ اسپیشل ساڑھیاں بنوائی گئی ہیں۔ ایک ایک پانچ پانچ سو کی، کیا سمجھے؟"

مسافر کچھ نہیں سمجھا۔ اُس نے صرف اتنا دیکھا کہ بھکارن دیوار سے لگی سردی کے مارے کانپ رہی ہے اور اُس کی گود کے بچے کا چہرہ اور بدن نیلا پڑتا جا رہا ہے۔

اور اسی وقت قریب کے ایک مندر میں بھجن شروع ہو گیا۔

جے جے رام کرشن ہرے۔ جے جے رام کرشن ہرے۔

اور مسافر کو نہ جانے کیا ہو گیا کہ وہ بھی زور زور سے بھجن گانے لگا۔ مگر یہ اُس کا اپنا بھجن تھا اور بازار کے سب لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کیونکہ یہ آواز جو اُن کو اپنے مَن کی لگتی تھی، انہوں نے صدیوں سے نہیں سُنی تھی۔ مسافر گا رہا تھا۔

اے بھگوان۔ یہ کیسا تیرا دربار
جہاں ہے ظلم کی بھرمار
رنگ محل میں بسیں مسخرے
عیش کریں سب چور لٹیرے
مُورکھ کو سب کہیں گیانی
گیانی کو سب کہیں گنوار
کوئی اوڑھے شال دوشالہ
اور کوئی ننگا پھرے بازار ـــــ یہ کیسا تیرا دربار
یہ کیسی سرکار رے بھگوان ـــ یہ کیسی سرکار

یہ سُن کر کسی نے کہا ـــ "ضرور کوئی کمیونسٹ ہے"۔

مگر دُوسرے نے کہا۔ "مجھے تو کبیر پنتھی لگتا ہے۔ یہ شبد تو کبیر کے جیسے ہیں۔"

تیسرے نے کہا "نہیں جی، کبیر پنتھی آج کل کبیر کے ایسے شبدوں کو کب یاد کرتے ہیں۔"

چوتھے نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں کوئی پاگل ہے بیچارہ۔"

پانچویں نے کہا۔ مگر خطرناک پاگل ہے جو ایسے خطرناک بھجن گاتا ہے۔"

چھٹے نے کہا۔ بے چارہ گا ہی تو رہا ہے۔ کچھ کر تو نہیں رہا۔"

ساتویں نے کہا۔ تم کیا جانو۔ ایسے شبد آگ لگا دیتے ہیں۔"

آٹھویں نے کہا۔ ایسے شبد تو وہ زہریلے ناگ ہیں جن کے کاٹے کا کوئی منتر ہی نہیں۔"

اور اتنے میں کوئی چلّایا۔ "دیکھو دیکھو وہ پگلا کیا کر رہا ہے؟"

سب نے مڑ کر اِدھر دیکھا کہ مسافر نے سیٹھ جی کا دوشالہ گھسیٹ کر ایک سائیکل رکشا والے کو دے دیا جو ایک پھٹی قمیص اور نیکر میں کھڑا ٹھٹھر رہا تھا اور دوشالہ پاتے ہی وہ رکشا والا پیڈل مارتا ہوا بگٹٹ ہو لیا اور ابھی سیٹھ جی ہائے واویلا کر ہی رہے تھے کہ مولانا جو مسجد سے واپس ہو رہے تھے دفعتہً چلّا پڑے " ارے میرا چوغہ، پکڑو پکڑو، چور میرا چوغہ لے بھاگا۔" مگر اتنے میں مسافر نے وہ اُونی چوغہ بھکارن کو دے دیا اور وہ اُس میں اپنے بچے کو لپیٹے سرپٹ بھاگی جا رہی تھی، اور اب سب مسافر کی تلاش کر رہے تھے اور مسافر وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔

مولانا کی داڑھی غصّے کے مارے ہِل رہی تھی اور وہ بار بار کہہ رہے تھے۔ جیسے اسمِ اعظم کا وِرد کر رہے ہوں "یا مظہر العجائب" ابھی وہ مرُدود یہاں تھا، اور ابھی غائب یا مظہر العجائب۔ ابھی وہ مردود یہاں تھا اور ابھی غائب!"

ایک نے کہا۔ دن دہاڑے ڈاکے پڑنے لگے۔ سیٹھ جی اور مولانا کو تھانے میں رپورٹ کرنی چاہیئے۔ چور فوراً پکڑا جائے گا۔"

دوسرے نے کہا۔ "چور نہیں جی ٹھگ تھا۔ آنکھوں میں دُھول جھونک کر دوشالہ اُڑا کر لے گیا۔"

تیسرے نے کہا۔ "بھئی شکل وصورت سے تو ٹھگ نہیں لگتا تھا۔ سیدھا سادا بڈھا تھا کوئی۔"

دوسرے نے جواب دیا۔ "بنارس کے دیکھنے میں ایسے ہی بھولے بھالے لگتے ہیں۔ ضرور وہ کوئی ٹھگ ہی تھا۔"

چوتھے نے کہا۔ پھر میرے خیال میں بھی وہ ٹھگ یا چور نہیں تھا ورنہ وہ چیزیں چُرا کر وہ خود لے جاتا۔ دوسروں کو کیوں دیتا۔ ضرور وہ پاگل ہے!"

اور سیٹھ جی کی توند مولانا کی داڑھی کی طرح غصّے کے مارے ہِل رہی تھی، بولے ۔۔ "پر یہ پاگل پن بڑا کھترناک ہے جی۔ دو چار ایسے پاگل ہور آ گئے تو ہمارا دھندہ ہی سودا بند ہو جاوے گا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے پاس رکھا ہوا ٹیلی فون اُٹھایا اور ڈائل گھمایا ___ ۸-۶-۰-۰-۴

(۳)

مگر مُسافر وہاں سے بہت دور سارناتھ کے کھنڈروں میں گھوم رہا تھا۔ جہاں نہ سیٹھ آتے ہیں نہ مولانا۔ نہ موٹروں میں گھومنے والے منتری۔ یہاں خاموشی تھی، سکون تھا۔ ماضی کی دُھول پر چلتے ہوئے پیروں کی آواز بھی نہ ہوتی تھی۔

بڑی دیر تک مسافر عجائب گھر میں بھگوان بُدھ کی مورتی کے سامنے کھڑا رہا اور گوتم کا ابھے مدرا اُسے جیسے دلاسہ دیتا رہا۔ اور پتھریلی آنکھیں جنھوں نے دنیا کے غم کی تہہ کو پا لیا تھا، اُس سے بہت کچھ کہتی رہیں اور اُسے ایسے محسوس ہوا کہ وہ ترشے ہوئے پتھریلے ہونٹ اس کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں۔ اے مسافر جس راستے پر تم چل رہے ہو اُس سے ہم بخوبی واقف ہیں، کیونکہ یہی ہمارا مارگ تھا۔ پر آج اس مارگ پر کون چلتا ہے۔ ہمارا پتہ بھی تو سُونا پڑا ہے۔ ہمارے تمہارے راستے کی دُھول پر تو صدیوں کے بعد کسی بھولے بھٹکے کے نقشِ قدم ملتے ہیں"۔

اور مسافر کی نگاہوں نے خاموشی کی زبان سے کہا ___ " مجھے شکتی دو۔ مجھے شانتی دو ___ شاکیہ منی۔ میں بہت دنوں کے بعد واپس آیا ہوں"۔

اور گوتم کے ہونٹوں نے بِن کھُلے کہا ___ " تم واپس نہیں آئے۔ تم کہیں گئے نہیں تھے۔ تم لوگوں کے من میں سو گئے تھے اور اب اُن کے مَن میں تم جاگ گئے ہو۔ تم یہیں تھے، اور یہیں رہو گے۔ تم یہاں ہو اور ہر جگہ ہو۔ جیسے میں یہاں ہوں، وہاں ہوں اور ہر جگہ ہوں۔ ہم ہر جگہ ہیں اور ہر وقت میں ہیں، مگر خاص کر ہم آج ہیں اور یہاں ہیں"۔

" پر شاکیہ منی۔ آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اُس سے میں بہت دُکھی ہوں"۔

اور گوتم کی آنکھوں نے خاموشی سے کہا ___ " دُکھ کیا ہے؟ سُکھ کیا ہے؟ کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہیں وہ ہمارے کرم ہیں، ہمارا عمل ہے اور آج تم نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ تمہارے بندوں میں سنگیت ہی نہیں شکتی بھی ہے"۔ اور اب مسافر نے دیکھا کہ وہ پتھریلی آنکھیں اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہی ہیں ___

پھر وہ گھومتا ہوا نئے بنے ہوئے بُدھ مندر کی طرف چلا آیا اور اندر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ سنگ مرمر کی سِلوں پر سیٹھوں، رئیسوں کے نام کھُدے ہیں اور اُن میں سیٹھ کروڑی مَل بکوڑی مَل کا نام بھی ہے، جس کا دوشالہ آج اُس نے چھینا تھا۔

" یہ کیا ہے؟" اس نے مندر کے ایک بھکشو سے پوچھا۔

اور پیلی کفنی پہنے ہوئے بھکشو نے کہا ___ " یہ اُن دانیوں کے نام ہیں جنہوں نے اِس مندر کو

بنانے کے لئے چندہ دیا تھا۔"

مسافر نے بڑبڑا کر کہا ــــ "تو انہوں نے چندہ مہاتما بُدھ کے لئے نہیں دیا تھا دھرم کے لئے نہیں دیا تھا۔ اِس مندر کے لئے نہیں دیا تھا۔ سنگِ مرمر کی سِل پر اپنا نام لکھوانے کے لئے دیا تھا۔"

اور وہ یہ کہہ کر اندر داخل ہوا اور اُس نے دیکھا کہ وہ مہان آتما جس نے دُنیا کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مُکتی دی تھی، وہاں ایک پیلی دھات سے بنائے ہوئے خول میں قید تھا۔

بھکشو نے کہا ــــ "اس مورتی پر آٹھ مَن سونے کا خول چڑھا ہوا ہے۔"

اور مسافر نے جواب دیا ــــ بڑی طاقت ہے سونے کی جو بُدھ جیسی آزاد آتما کو بھی اپنے پنجے میں جکڑ سکتی ہے۔" مگر یہ بات اس بھکشو کی سمجھ میں نہ آئی۔

پھر مسافر نے دیکھا کہ چاروں طرف بھدّی بھدّی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن میں مہاتما بدھ کی زندگی کے مختلف منظر پیش کئے گئے ہیں۔

بھکشو نے کہا ــــ "یہ تصویریں جاپان کے ایک مہان کلاکار نے اپنی شردھا سے بنائی ہیں۔ پُورے چار برس لگے تھے اُسے یہ کام پورا کرنے میں۔ وہ دیکھو کونے میں جاپانی آرٹسٹ کا پورا نام پتہ لکھا ہوا ہے۔"

اور ایک یاتری نے مسافر سے کہا ــــ "صرف چار برس۔ پھر بھی آرٹسٹ کو اپنا نام پتہ لکھنے کی اتنی فکر تھی اور اجنتا ایلورا کے غاروں میں دیکھو۔ ایک ایک غار کو اُس کے مجسموں اور تصویروں کو مکمل کرنے میں ڈھائی ڈھائی سو سال لگے اور کلاکاروں کی کئی کئی نسلوں نے ایک کے بعد ایک اس لافانی آرٹ کو تخلیق کیا۔ پھر بھی کسی نے ایک جگہ بھی اپنا نام نہیں لکھا۔ اسے کہتے ہیں سچی شردھا۔ سچی کلا۔"

مسافر نے یہ بات بڑے غور سے سنی۔ پھر وہ بولا "نام کے لئے لوگ سب کچھ کرتے ہیں۔ بُدھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔"

مگر اِس عرصہ میں وہ بھکشو دوکان پر کھڑا تصویریں اور مورتیاں اور کتابیں بیچ رہا تھا۔ اب مسافر نے دیکھا کہ ایک اور بھکشو ہے جو بُدھ کی مورتی کے سامنے بار بار سجدہ کر رہا ہے۔

اور اُس نے سوچا ــــ "مگر بُدھ نے تو کہا تھا، میری مورتی نہ بنانا اور یہ بھی کہا تھا کہ کسی کی مُورتی کے آگے ماتھا نہ ٹیکنا۔"

مگر وہ بھکشو منہ ہی منہ میں کوئی دُعا بڑبڑا رہا تھا اور ہر بار سارے بدن کو زمین پر گرا کر ماتھا ٹیک رہا تھا۔ پہلے تو مسافر نے سمجھا کہ وہ کوئی ورزش کر رہا ہے اور اُس نے ایک یاتری سے کہا بھی ــــ "یہ مندر ہے کہ اکھاڑا؟" مگر یاتری نے کہا "شش شش بھکشو مہاراج پوجا کر رہا ہے۔ بھگوان بُدھ کی مورتی کی۔"

اور اب مسافر نے دیکھا کہ اس بھکشو نے سنگِ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر دو بالشت چوڑا ٹاٹ بچھا کر کیا ہوا

اُونی کپڑا بچھا رکھا ہے، تاکہ اس کا بدن ٹھنڈے پتھر کو نہ لگے۔ جہاں اس کے ہاتھ زمین پر آتے تھے، وہاں بھی دونوں طرف ایک ایک اُونی کپڑے کا ٹکرا پڑا ہوا ہے، تاکہ بھکشو کے ہاتھوں کو بھی ٹھنڈے فرش کو نہ چھونا پڑے کتنا خیال تھا اُس بھکشو کو اپنے آرام کا، مگر وہ برابر اپنی کسرت کیے جا رہا تھا۔ جھکتا، زمین پر منھ کے بل، اوندھا لیٹتا، پھر اُٹھتا، پھر جھکتا۔ اور تمام عرصے کوئی دعائیں بڑبڑاتا رہا اور مسافر کو ایسا لگا کہ یہ ایک بھکشو نہیں ہے بلکہ پوجا کرنے کی ایک مشین ہے جو بٹن دبانے پر اُٹھک بیٹھک کرنے لگتی ہے۔

اور اُسے ایسا لگا کہ یہ بھکشو اپنی ریاکارانہ عبادت سے بھگوان بُدھ کی ہتک کر رہا ہے۔ اُن کا، اُن کی پوِتر آتما کا منھ چڑا رہا ہے اور اُس نے ایک ہی وار میں بھکشو کے سامنے سے وہ گدیاں گھسیٹ لیں اور اس بار بھکشو سجدے میں گیا تو اُس کا ماتھا دھڑ سے ٹھنڈے سخت پتھر پر لگا اور ایک پل میں اُس کی تپسیا، اُس کی شردھا اور اُس کی پوجا اور اس کی اہنسا کا بھرم کھُل گیا اور مسافر کو مارنے کے لئے اس کے پیچھے دوڑا مگر اس عرصے میں مسافر نے مورتی استھان کے پاس سے گھڑیال بجانے کی ایک لوہے کی موگری اُٹھالی تھی اور اُس سے وہ مورتی پر چڑھے ہوئے پیلی دھات کے خول کو توڑ رہا تھا۔ بُدھ کو سونے کی قید سے آزاد کر رہا تھا۔

کتنے ہی بھکشو، پہرے دار یاتری مسافر کے پیچھے دوڑے لیکن وہ اُن کے ہاتھ نہ آیا۔ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا اور جب اُس کا پیچھا کرنے والے مندر سے باہر نکل کر بھاگے تو انہوں نے دیکھا کہ دروازے کے دونوں طرف جو سنگِ مرمر کی تختیاں لگی تھیں، جن پر چندہ دینے والے سیٹھوں کے نام اور اُن کے چندے کی رقمیں لکھی ہوئی تھیں، اِن کو کوئی پاگل اس طرح چکنا چور کر گیا ہے کہ اب نہ سیٹھ کروڑی مَل پکوڑی مل کا نام پڑھا جاتا ہے اور نہ اُن کی دان کی ہوئی سو روپے کی رقم۔

"بالکل پاگل ہے مہاراج" بھکشوؤں نے مندر کے مینیجر کو رپورٹ کی جو اپنے رجسٹر میں دان کی رقموں کا حساب کتاب لکھ رہا تھا اور پہرے دار بولا ـــ بڑا خطرناک پاگل ہے مہاراج، مُورتی پر چڑھے ہوئے سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کر گیا اور خود اس میں سے ایک ٹکڑا بھی اٹھا کر نہ لے گیا ـــ بالکل پاگل، مہاراج!"

اور مندر کے مینیجر نے "بدھم شرنم گچھامی کہہ کر ٹیلی فون اُٹھایا اور ڈائل گھمایا ۔ ۸ ۔ ۲ ۔ ۰ ۔ ۰ ۔ ۴

(۴)

"مہاراج!" ایک آواز آئی مگر مسافر نے مڑ کر نہ دیکھا۔

"شریمان!" وہی آواز پھر آئی مگر اب بھی اس نے ادھر کوئی توجہ نہ کی۔

بازار میں شام کے وقت بہت بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا ـــ ہو سکتا ہے کسی اور ہی کو آواز دے رہا ہو۔

"او بھائی صاحب!"

"اے مسٹر!"

"اجی سنیئے تو!"

"ارے او۔۔۔!"

"اے۔۔۔۔!"

اور اس آخری "اے" میں اتنا زور تھا کہ مسافر ٹھٹک کر رک ہی گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک آدمی سفید کرتا دھوتی اور اونی بنڈی پہنے، بالوں میں تیل ڈالے، ماتھے پر چندن لگائے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

"کیا ہے بھائی؟"

"تم بنارس میں آج ہی آئے ہو لگتا ہے! کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں ہمیشہ سے بنارس ہی میں رہتا آیا ہوں، مگر اس وارانسی میں آج پہلی بار آیا ہوں۔"

"کیا ہے وہاں؟"

"ارے بھگوان کے درشن ہوں گے۔"

"کیوں بھگوان یہاں نہیں ہیں کیا، وہاں قید کر رکھا ہے کسی نے؟"

"ارے نہیں، وہاں شیو بھگوان کی مورتی ہے، اس کے درشن کرنا پوجا کرنا۔"

مسافر نے کہا۔ "اگر پتھر پوجنے سے ہی بھگوان ملتا ہے تو چکی کی پوجا کیوں نہ کروں جو آٹا پیس کر انسانوں کا پیٹ بھرتی ہے۔"

"ارے نہیں، یہ پتھر کی نہیں سونے کی مورتی ہے۔ مندر کے کلس پر چھبیس من سونا چڑھا ہوا ہے۔"

"مجھے بھگوان کی مورتی نہیں دیکھنی۔ نہ پتھر کی نہ سونے کی۔ میں تو بھگوان کو ہر روز، ہر گھڑی، ہر پل دیکھتا ہوں۔"

چکنے بالوں والا سمجھا، یہ بڈھا اُس سے مخول کر رہا ہے۔ سو وہ بولا ـــ کیوں بڑے میاں بھلا بھگوان کو کہاں کہاں دیکھا ہے تم نے؟"

مسافر نے جواب دیا ـــ "میں نے بھگوان کو گلی میں بھیک مانگتے دیکھا ہے ـــ میں نے بھگوان کو پھٹی قمیص پہنے سردی میں ٹھٹھرتے دیکھا ہے۔ میں نے بھگوان کو شراب خانے میں دیکھا ہے۔ وہ شراب میں ہے، شراب کی بھٹی میں بھی ہے وہی شراب بناتا ہے وہی پلاتا ہے، وہی پیتا ہے، وہی صراحی ہے، وہی پیالہ ہے، وہی متوالا ہے۔"

مسافر ابھی بول ہی رہا تھا کہ وہ چکنے بالوں والا گھبرا کر وہاں سے چلتا بنا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ باپ رے میں بھی کس پگلے کے پلے پڑ گیا۔

مسافر آگے چلا تو ایک اور پنڈا اُسے ملا۔ وہ بولا ــــ "مہاراج لگتا ہے، آج ہی آپ اس پوتر بھومی میں پدھارے ہیں۔ چلو تمہیں گنگا جی میں اشنان کروالاؤں!"

مسافر نے پوچھا ــــ کیوں، گنگا میں اشنان کرنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"جیون کے سب پاپ دُھل جاتے ہیں۔ ایک بار گنگا اشنان کروگے، سیدھے سورگ میں جاؤ گے۔"

مسافر نے ایک پل سوچ کر جواب دیا ــــ "کیوں شریمان، جو کوئی بھی گنگا نہاتے وہ سچ مچ سُورگ میں جاتا ہے؟"

پنڈے نے کہا ــ بالکل سیدھا سُورگ میں جاتا ہے!"

اور مسافر بولا ــ "تو پھر تو سب دھوبی اور دریا کے سب کچھوے سیدھے سورگ جانے چاہئیں۔"

"پاگل ہے بیچارہ ــ" پنڈے نے سوچا اور نئی اور شکار کی تلاش میں چل پڑا۔ گھومتے گھومتے مسافر اب شمشان گھاٹ پر پہنچ گیا ــ جہاں اُس نے دیکھا کہ لکڑی کے ڈھیروں پر چتائیں جل رہی ہیں۔ اُن پر گھی اور تیل ڈالا جا رہا ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ برہمن اشلوک پڑھ رہے ہیں۔ مرنے والے کے رشتہ دار برہمنوں کو دان دے رہے ہیں۔

مسافر نے ایک آدمی سے پوچھا جو جلتی ہوئی لکڑیوں کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ "کیوں بھائی کیا حال ہے؟"

"دھندا بڑا مندا ہے آجکل بھائی!"

مسافر نے پوچھا ــ "کون سا دھندا؟"

"یہی کریا کرم کا دھندا۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے، لوگوں نے مرنا ہی کم کر دیا ہے۔ کہاں دس برس پہلے روز سوڈیڑھ سو لاشیں آتی تھیں۔ اب مشکل سے پچیس تیس آتی ہیں۔ پہلے سارے دیش کے کونے کونے سے لوگ یہاں مرنے آتے تھے۔ اب اَدھرم پھیل رہا ہے اور کتنے ہی لوگ اپنے گھر میں مرنا ہی پسند کرتے ہیں۔"

مسافر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "بڑا افسوس ہے بھائی۔ پھر بھی بھگوان پر بھروسہ رکھو وہ سب کا پالن ہار ہے۔"

اتنے میں مسافر نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی اکیلا اپنے بازوؤں پر کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش اُٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کوئی ارتھی کو کندھا دینے والا نہیں ہے۔

مسافر نے بوڑھے کے پاس جا کر کہا ــــ "تم تھک گئے ہو گے، لاؤ لاش کو مجھے دیدو!"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لاش کو مسافر کے سپرد کرتے ہوئے وہ بولا ــ "ذرا سنبھال کے بھائی۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔" اس کے لئے وہ اب تک "ہے" تھا "تھا" نہیں ہوا تھا۔

اب وہ دونوں گھاٹ کے کنارے ایک جگہ پہنچے، جہاں لوہے کے کٹہرے کے پاس لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔

"اے اے!" ایک پانڈا چلاتا ہوا آیا "تم لوگ اِدھر کیسے آتے ہو؟ یہ راجوں مہاراجوں کے کِریا کی جگہ ہے۔ یہاں انتم سنسکار کرنے کے پانچ سو روپے ہوتے ہیں۔"

"پانچ سو روپے!" مسافر نے دہرایا۔ "موت بھی اتنی مہنگی ہوگئی ہے!"

"ہاں ہاں، جانتے ہو، یہ چندن کی لکڑی ہے۔ راجوں مہاراجوں کے لئے منگائی جاتی ہے۔ جاؤ اُدھر کے گھاٹ پر جاؤ۔"

مگر دوسری طرف دوسرے پہرے دار کھڑے تھے۔ موت کے محل کے چوکیدار۔

"چالیس روپے کی تو لکڑی ہی آئے گی۔" ایک نے کہا ـــ "روپے نکالو۔"

"پانچ روپے کا گھی۔" دوسرے نے ہاتھ بڑھایا۔

"پانچ روپے پنڈت کو دان" تیسرے نے اپنی مٹھی کھولی۔

"کل پچاس روپے ہوں گے۔" چوتھے نے حساب بتلا دیا۔

"مگر سوا روپیہ ٹھیکیدار کو دینا ہوگا۔"

"ٹھیکیدار!" مسافر نے حیرت سے کہا۔ "کیا کسی نے موت کا ٹھیکہ بھی لیا ہوا ہے؟"

"ہاں، ہاں، ٹھیکیدار کو سوا روپے دیئے بنا یہاں کوئی کِریا نہیں کرسکتا۔"

دوسرے نے کہا۔ "اکیاون روپے اور پچیس نئے پیسے نکالو۔

تیسرے نے کہا ـــ "نہیں ہیں تو گھر کا راستہ لو۔"

چوتھے نے لاٹھی پٹختے ہوئے کہا۔ "چلو جلدی کرو۔ دھندے کا ٹائم ہے۔"

اور بوڑھا جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا جاری تھی۔ اُس نے مسافر کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں، جو تھا وہ اس کی دوا دارو پہ لگا دیا۔"

اتنے میں کسی امیر آدمی کی ارتھی آئی۔ سیکڑوں آدمی ساتھ میں بینڈ باجہ، ہار پھول۔ لگتا تھا کسی کی برات ہے۔

موت کے سب ٹھیکیدار اُدھر بھاگے۔

اب یہ تین اکیلے رہ گئے۔

مسافر۔

بوڑھا،

اور بوڑھے کے جوان بیٹے کی لاش۔

مسافر نے دیکھا کہ لکڑی کے ایک بڑے ڈھیر پر ایک چتا جل رہی ہے اور اس کے پاس کوئی نہیں ہے کیونکہ سب بینڈ باجے والی ارتھی کو دیکھنے چلے گئے ہیں۔ اس نے ایک پل کے لئے کچھ سوچا اور اس کے بعد دبے پاؤں جلتی چتا کے پاس گیا اور وہاں بوڑھے کے لڑکے کی لاش کو جلنے کے لئے رکھ دیا۔ چند ہی لمحوں میں ایک کے بجائے دو لاشیں جل رہی تھی۔

بوڑھے نے کہا۔ "دھنیہ واد بھائی" اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اُس کے رونے کی آواز سُن کر موت کے کئی ٹھیکیدار اُدھر دوڑ کر آتے اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ ایک لاش کو بغیر فیس دیئے جلا دیا گیا تو انھوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔

"کس نے بے اجازت یہ لاش اس چتا پر رکھی؟"

"میں نے!" مسافر نے کہا۔

"تو نکالو اکیاون روپے" ایک نے کہا۔

دُوسرے نے یاد دلایا ــــ "اور پچیس نئے پیسے!"

پیسے ہمارے پاس نہیں ہیں"! مسافر نے کہا۔

"تو پھر ہم اس لاش کو چتا پر سے اُٹھا کر دریا میں بہا دیں گے۔"

مسافر نے بڑی نرمی سے کہا ــــ "وہ اب بھی مُردہ ہے اور جب بھی مردہ رہے گا۔ جلنے سے جلنے سے اُس کی آتما کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا مگر اس کے بوڑھے باپ کو دُکھ ہوگا ــــ" اور پھر اُس کی آواز میں ایک سختی کا انداز آگیا۔ "سو میں یہ نہ ہونے دوں گا" اور وہ چتا اور موت کے ٹھیکیداروں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔

"ہم تمہیں بھی اس آگ میں جھونک دیں گے بڑے میاں۔"

"جھونک دو۔ میں اب جلنے، ڈوبنے، مرنے کے خطروں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو چکا ہوں۔ مگر تم میں سے کم از کم ایک کو میں اپنے ساتھ اس آگ میں گھسیٹ لے جاؤں گا۔"

لٹھیل اس کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی نے چلا کر کہا ــــ "ارے اس کے پاس نہ جانا۔ یہ تو پاگل ہے۔ بڑا خطرناک پاگل ہے۔ اسی نے آج بازار میں سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل کا دوشالا اُتار لیا! اب سُنا ہے سارناتھ میں جا کر بھگوان بدھ کی مُورتی توڑ ڈالی۔ پولیس اور پاگل خانے والے سارے شہر میں اُس کی ڈھنڈیا مچا رہے ہیں۔ ایک اور آدمی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بھی یہی سُنا ہے۔ پاگل آدمی کا کیا ٹھیک، آگ میں کُود پڑے اور ساتھ کسی اور کو بھی لے مرے۔ میں نے تو سُنا ہے پولیس شکاری کتّے لے کر اُس کا پیچھا کر رہی ہے"۔ سو لٹھیل پیچھے ہٹ گئے اور بوڑھے کے نوجوان بیٹے کی لاش جل گئی اور جب چتا کے شعلے مدھم پڑے تو سب نے دیکھا کہ وہ پگلا غائب ہے اور بوڑھا اکیلا کھڑا

اپنے بیٹے کی راکھ کرید رہا ہے۔

"چلو چلو!" ایک نے کہا۔ "تھانے میں رپورٹ کریں کہ پگلا ادھر ہی کہیں گھوم رہا ہے۔"

تھانیدار صاحب نے بڑے غور سے اُن کی رپورٹ کو سُنا اور پھر ٹیلی فون اُٹھا کر نمبر ملایا۔ ۸-۶-۴۰۔

(۵)

جاڑے کی رات اندھیری تھی۔ کالے آسمان میں ستارے ایسے جھلملا رہے تھے جیسے جھک کر دیکھنا چاہتے ہوں۔ نیچے زمین پر کیا ہو رہا ہے۔

ٹھٹھری ہوئی سُنسان سڑکوں پر پولیس کے شکاری کُتے ایک پاگل کی تلاش کر رہے تھے۔ جس نے ایک دن میں سارے شہر کو تہ و بالا کر دیا تھا۔

ایک اُجاڑ سُنسان مندر میں پجاری دروازہ بند کر رہا تھا کہ اُس نے ایک پرچھائیں دیکھی۔

"کون ہے؟" اس نے ڈانٹ کر کہا۔ کیونکہ اُسے ڈر لگ رہا تھا۔

"میں ایک مسافر ہوں۔ رات کے لئے ٹھکانا چاہتا ہوں۔ آگیا ہو تو مندر میں لیٹ رہو؟"

"کون جات ہو؟"

"مُنشیہ جات ہوں، مہاراج!"

"وہ جاتی ہم نہیں جانتے — دھرم کیا ہے؟ ہندو تو ہو نا؟"

مسافر نے کئی پل سوچ کر گزارے۔ پھر بولا — "نہیں مہاراج، میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں ہندو نہیں ہوں۔"

"پھر کیا ہو؟"

"انسان!"

"تو پھر جاؤ — انسانوں کا کوئی مندر کھوجو۔"

اور مسافر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

مسجد کا مُلّا عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے حُجرے میں جا رہا تھا کہ اُس نے دیوار کے پاس ایک سایہ دیکھا۔

"اے کون ہے؟"

"میں ہوں — ایک مسافر!"

"کیا چاہتے ہو؟"

"رات بھر کے لئے ٹھکانا بہت تھک گیا ہوں مولوی جی۔"

"تم کون ہو؟ مسلمان ہو نا؟"

ایک بار پھر مسافر نے جواب دینے سے پہلے توقف کیا ــــ "جی نہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔"

"تو پھر کیا ہو؟"

"انسان ہوں!"

جواب میں ملاّ نے دروازہ بند کر دیا۔

اور اب رات تھی۔ اندھیرا تھا۔ سناٹا تھا۔ برفیلی سرد ہوا تھی اور ایک مسافر تھا۔ بے ٹھکانا۔ اور دُور سے شکاری کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔

تاروں کی روشنی میں ایک سفید سفید عمارت جھلملائی۔ پاس ہی چند لوگ الاؤ جلا کر ہاتھ تاپ رہے تھے۔

"کیوں بھائی یہ عمارت کیا ہے؟ ایک طرف سے مسجد لگتی ہے، ایک طرف سے مندر"

"جی یہ مسجد بھی تھی اور مندر بھی۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں اسے بنایا گیا تھا کہ ہندو مسلمان سب دھرم والے ایک ہی جگہ اپنی اپنی عبادت یا پوجا پاٹھ کیا کریں۔ پھر اورنگ زیب نے اُسے توڑ کر مسجد بنا دیا۔ بعد میں کسی راجہ نے اُسے مندر بنا دیا۔

"اور اب یہ کیا ہے؟" مسافر نے پوچھا۔

"اب یہ نہ مندر ہے نہ مسجد۔ کچھ بھی نہیں ہے۔"

"بس تو میرے جیسے آدمی کے لئے جو سب کچھ ہے اور کچھ نہیں ہے۔ جو ہر جگہ ہے اور کہیں نہیں ہے۔ یہی جگہ ٹھیک ہے۔"

ابھی وہ اس عمارت کے باہر ہی تھا کہ شکاری کتّوں کی آواز قریب آ گئی۔ بہت قریب۔

(۶)

تھانے میں سب انسپکٹر پولیس نے پوچھا ــــ اے بڈھے تمہارا نام؟"

مسافر نے اپنا نام بتا دیا۔

"کام کیا کرتے ہو؟"

پہلے بُنکر تھا۔ جسے آپ جیسے لوگ جلاہا بھی کہتے ہیں ــــ کپڑا بُنا کرتا تھا اور پریم کے تانے اور گیان کے بانے سے سچائی کی چادر بننے کی کوشش کرتا تھا۔ پر میرا کرگھا تو کب کا ٹوٹ گیا۔ اُسی کی تلاش میں آیا تھا کہ شاید کسی اور کو مل گیا ہو اور میرا کام کر رہا ہو ــــ مگر آپ نے وقت ہی نہیں دیا۔"

"سچ مچ پاگل ہے۔" سب انسپکٹر نے اپنے حولدار سے کہا۔ "ابھی بھیجدیتے ہیں، نہیں تو رات کو نہ جانے یہاں کیا گل کھلائے۔"

تو پھر اُس نے ٹیلیفون اٹھایا اور ڈائل گمایا۔

چار۔

صفر۔

چھ۔

آٹھ۔ ۸-۶-۰۰-۴

اُدھر سے آواز آئی۔ "ہیلو! ہم پاگل خانے سے بول رہے ہیں۔"

اور سب انسپکٹر نے کہا۔ "ارے بھئی، وہ بنارس کا ٹھگ پکڑا گیا۔ ٹھگ وگ نہیں ہے۔ بڈھا بالکل پاگل لگتا ہے۔ سو اُسے بھیج رہے ہیں، کرپا کر کے ابھی داخلہ کر لو۔"

اُدھر سے آواز آئی۔ "نام؟ نام کیا ہے؟"

سب انسپکٹر نے کہا۔ "نام ہے کبیرا۔" اور فون رکھ دیا مگر مسافر وہاں سے جا چکا تھا۔

# میری موت

لوگ سمجھتے ہیں کہ سردار جی مارے گئے۔

نہیں۔ یہ میری موت ہے۔ پرانے "میں" کی موت۔ میرے تعصبات کی موت۔ اس منافرت کی موت جو میرے دل میں تھی۔

میری یہ موت کیسے ہوئی؟ یہ بتانے کے لئے مجھے اپنے پرانے مردہ "میں" کو زندہ کرنا پڑے گا۔

میرا نام شیخ برہان الدین ہے۔

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم اور مسلمان کا خون سستا ہو گیا تو میں نے سوچا واہ ری قسمت پڑوسی بھی ملا تو سکھ۔ حق ہمسائیگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا، نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں سکھوں پر ہنستا بھی تھا۔ اُن سے ڈرتا بھی تھا اور کافی نفرت بھی کرتا تھا۔ آج سے نہیں بچپن سے میں شاید چھ برس کا تھا۔ جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلا پڑا "ارے وہ دیکھو، عورت کے منہ پر کتنی لمبی داڑھی!" جیسے جیسے عمر گزرتی گئی یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہوتا گیا۔ گھر کی بوڑھیاں جب کسی بچے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں۔ مثلاً یہ کہ اُسے نمونیہ ہو گیا تھا، یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو کہتیں "اب سے دُور کسی سکھ فرنگی کو نمونیہ ہو گیا تھا یا اب سے دور کسی سکھ فرنگی

کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ کوسنا ۱۸۵۷ء کی یادگار تھا۔ جب ہندو مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو دبانے میں پنجاب کے سکھ راجوں اور اُن کی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی، صرف ایک مبہم سا خوف، ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب، ڈر انگریز سے بھی لگتا تھا اور سکھ سے بھی۔ مگر انگریز سے زیادہ۔ مثلاً جب میں کوئی دس برس کا تھا۔ ایک روز دہلی سے علی گڑھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر ہوتا تھا۔ سوچا کہ اب کی بار سیکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے۔ ٹکٹ خرید لیا اور ایک خالی ڈبے میں بیٹھ کر گدّوں پر خوب کُودا، باتھ روم کے آئینے میں اُچک اُچک کر اپنا عکس دیکھا۔ سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا۔ روشنیوں کو کبھی جلایا کبھی بجھایا۔ مگر ابھی گاڑی کے چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ لال لال منہ والے چار فوجی گورے آپس میں ڈیم بلاڈی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے درجے میں گھس آئے۔ اُن کو دیکھنا تھا کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفو چکر ہو گیا اور اپنا سُوٹ کیس گھسیٹتا میں بھاگا اور ایک نہایت کھچا کھچ بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آ کر دم لیا یہاں دیکھا تو کئی سکھ داڑھیاں کھولے، کچھے پہنے بیٹھے تھے مگر میں اُن سے ڈر کر درجہ چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ صرف اُن سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

ہاں تو ڈر سکھوں سے بھی لگتا تھا اور انگریزوں سے اُن سے زیادہ۔ مگر انگریز انگریز تھے اور کوٹ، پتلون پہنتے تھے جو میں بھی پہننا چاہتا تھا اور ڈیم بلاڈی فول والی زبان بولتے تھے جو میں بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حاکم تھے اور میں بھی چھوٹا موٹا حاکم بننا چاہتا تھا۔ وہ کانٹے چھری سے کھانا کھاتے تھے اور میں بھی کانٹے چھری سے کھانا کھانے کا خواہاں تھا تاکہ دنیا مجھے بھی مہذب اور متمدن سمجھے مگر سکھوں سے جو ڈر لگتا تھا، وہ حقارت آمیز کتنے عجیب الخلقت تھے۔ یہ سکھ جو مرد ہو کر بھی سر کے بال عورتوں کی طرح طرح طرح لمبے لمبے رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال مُنڈانا کچھ مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ ابّا کے اِس حکم کے باوجود کہ ہر جمعہ کو سر کے بال خشخشی کرائے جائیں۔ میں نے بال خوب بڑھا رکھے تھے تاکہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اڑیں جیسے انگریزی کھلاڑیوں کے ابا کہتے "یہ کیا عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں" مگر ابّا تو تھے ہی پُرانے دقیانوسی خیال کے۔ ان کی بات کون سُنتا تھا۔ اُن کا بس چلتا تو سر پر اُسترا چلوا کر بچپن میں بھی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بندھوا دیتے.....

ہاں اس پر یاد آیا کہ سکھوں کے عجیب الخلقت ہونے کی دوسری نشانی ان کی داڑھیاں تھیں اور پھر داڑھی، داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ابّا کی داڑھی جس کو نہایت اہتمام سے نائی فرنچ کٹ بنایا کرتا تھا یا تایا ابّا کی جو نکیلی اور چوپٹ دار تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں۔ جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھتی ہی رہے بلکہ تیل اور دہی اور نہ جانے کیا کیا ملکر بڑھائی جائے اور جب کئی فٹ لمبی ہو جاتے تو اس میں کنگھی کی جائے جیسے عورتیں سر کے بالوں میں کرتی ہیں..... عورتیں یا مجھ جیسے اسکول کے فیشن ایبل لڑکے

اس کے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی اور وہ بھی اس میں کنگھی کرتے تھے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ ......... میرے دادا جان ٹھیرے اور سکھ پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجا گیا۔ کالج میں جو پنجابی لڑکے پڑھتے تھے، اُن کو ہم دہلی اور یو۔پی والے پنج، جاہل اور اُجڈ سمجھتے تھے۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ کھانے پینے کی تمیز۔ تہذیب و تمدن چھو نہیں گئے تھے۔ گنوار، لٹھ۔ یہ بڑے بڑے لسّی کے گلاس پینے والے بھلا کیوڑے دار فالودے اور لپٹن کی چائے کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ۔ بات کریں تو معلوم ہو لڑ رہے ہیں۔ اَسی، تُسی، ساڈے، تُہاڈے ......... لاحول ولا قوۃ۔ میں تو ہمیشہ ان پنجابیوں سے کتراتا تھا مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا کہ انھوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرے میں جگہ دیدی۔ میں نے سوچا چلو جب ساتھ ہی رہنا ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کرلی جاتے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزے دار آدمی تھا اور لطیفے خوب سُنایا کرتا تھا۔

اب آپ کہیں گے ذکر شروع ہوا تھا سردار صاحب کا۔ یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا۔ اگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سُناتا تھا وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے جن کو سُن سُن کر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات و خصائل، اُن کی نسلی خصوصیات اور اجتماعی کیریکٹر کا بخوبی علم ہوگیا تھا۔ بقول غلام رسول کے:۔

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو اُن کی عقل بالکل خبط ہوجاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں کتنے ہی واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر سوار امرت سر کے ہال بازار سے گزر رہے تھے۔ چوراہے پر ایک سکھ کانسٹبل نے روکا اور پوچھا "تمہاری سائیکل کی لائٹ کہاں ہے؟" سائیکل سوار سردار جی گڑگڑا کر بولے "جمعدار صاحب ابھی ابھی بجھ گئی ہے، گھر سے جلا کر تو چلا تھا۔" اس پر سپاہی نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ ایک راہ چلتے سفید داڑھی والے سردار جی نے بیچ بچاؤ کرایا۔ "چلو بھئی کوئی بات نہیں لائٹ بجھ گئی ہے تو اب جلا لو۔" اور اسی قسم کے سیکڑوں قصے غلام رسول کو یاد تھے اور انھیں جب وہ پنجابی مکالموں کے ساتھ سناتا تھا تو سُننے والوں کے پیٹ میں بل پڑجاتے تھے۔ اصل میں اُن کو سُننے کا مزہ پنجابی ہی میں تھا کیونکہ اُجڈ سکھوں کی عجیب و غریب حرکتوں کے بیان کرنے کا حق کچھ پنجابی جیسی اُجڈ زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔

سکھ نہ صرف بیوقوف اور بدھو تھے بلکہ گندے تھے جیسا کہ ایک ثبوت تو غلام رسول کا (جس نے سیکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا) یہ تھا کہ وہ بال نہیں منڈاتے تھے۔ اس کے علاوہ برخلاف ہم صاف ستھرے نمازی مسلمانوں کے جو ہر اٹھوارے جمعہ کے جمعہ غسل کرتے ہیں، یہ سکھ کچھا باندھ سب کے سامنے نل کے

نیچے بیٹھ کر نہاتے تو روز ہیں مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں نا جانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں۔ مثلاً دہی۔ ویسے تو میں بھی سر میں لائم جیوس گلیسرین لگاتا ہوں جو کسی قدر گاڑھے دودھ سے مشابہ ہوتی ہے مگر اس کی بات اور ہے۔ وہ ولایت کی مشہور پرفیومر فیکٹری سے نہایت خوبصورت شیشی میں آتی ہے اور دہی کسی گندے سندے حلوائی کی دکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں سے کیا لینا۔ مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ لوگ اکھڑ پن، بدتمیزی اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ اب دنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان دس ہندوؤں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ خیر پھر یہ سکھ مسلمانوں کے رُعب کو نہیں مانتے تھے۔ کرپانیں لٹکائے، اکڑا اکڑا کر مونچھوں بلکہ داڑھی پر بھی تاؤ دیتے چلتے تھے۔ غلام رسول کہتا اُن کی ہیکڑی ایک دن ہم ایسی نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی تو کریں گے۔

کالج چھوڑے کئی سال گزر گئے۔ طالب علم سے میں کلرک اور کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علی گڑھ کا ہوسٹل چھوڑ نئی دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کر لیا۔ شادی ہو گئی۔ بچے ہو گئے مگر کتنی ہی مدت کے بعد۔ مجھے غلام رسول کا وہ کہنا یاد آیا جب ایک سردار صاحب میرے برابر کے کوارٹر میں رہنے کو آتے ـــــ یہ راولپنڈی سے بدلی کرا کر آتے تھے کیونکہ راولپنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیش گوئی کے بموجب سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح سے نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے ان کا صفایا کر دیا تھا۔ بڑے سور مانتے تھے، کرپانیں لئے پھرتے تھے۔ بہادر مسلمانوں کے سامنے اُن کی ایک نہ بنی۔ اُن کی داڑھیاں مونڈ کر اُن کو مسلمان بنایا گیا تھا۔ زبردستی اُن کا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس حسب عادت مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے یہ لکھ رہا تھا کہ سکھ عورتوں اور بچوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان مجاہد کبھی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا۔ رہیں عورتوں اور بچوں کی لاشوں کی تصویریں جو چھاپی جا رہی تھیں، وہ یا تو جعلی تھیں اور اسکھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہوگا۔ راولپنڈی اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ہندو اور سکھ لڑکیوں کو بھگایا تھا حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کی جوانمردی کی دھاک بیٹھی ہے اور اگر نوجوان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں خود ہی لٹو ہو جائیں تو اُن کا کیا قصور ہے؟ وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ان لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں۔ ہاں تو سکھوں کی نام نہاد بہادری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ بھلا اب تو ماسٹر تارا سنگھ لاہور میں کرپان نکال کر مسلمانوں کو دھمکیاں دے۔ پنڈی سے بھاگے ہوئے سردار اور اُس کی خستہ حالی کو دیکھ کر میرا سینہ عظمتِ اسلام کی روح سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی، حالانکہ

موت کے منہ سے بچ کر آتے تھے۔ مگر یہ حضرت ہر وقت دانت نکالے ہنستے رہتے تھے، جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دراصل کتنا بیوقوف اور بے حس ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ نہ جانے سکھوں کا کون سا تہوار تھا اس دن پرشاد کی مٹھائی بھی بھیجی (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی کو دیدی) پر میں نے زیادہ منہ نہ لگایا۔ کوئی بات ہوئی سو کھا سا جواب دیدیا اور بس۔ میں جانتا تھا کہ سیدھے منہ دو چار باتیں کر لیں تو یہ پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ آج باتیں تو کل گالم گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہے کون اپنی زبان گندی کرے۔ ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھا کر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصے سنا رہا تھا۔ اس کا عملی ثبوت دینے کے لئے عین بارہ بجے میں نے اپنے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا کہ پوچھ کر آئے کیا بجا ہے؟" انہوں نے کہلوا دیا "بارہ بج کر دو منٹ ہوتے ہیں"۔ میں نے کہا "بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں یہ" اور ہم خوب ہنسے۔ اس کے بعد میں نے کئی بار بے وقوف بنانے کے لئے سردار جی سے پوچھا "کیوں سردار جی! بارہ بج گئے؟" اور وہ بے شرمی سے دانت پھاڑ کر جواب دیتے "جی اساں دے تاں چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں"۔ اور یہ کہہ کر خوب ہنسے۔ گویا یہ بڑا مذاق ہوا۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اول تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں۔ کب بچے ہی کے گلے پر کرپان چلا دے۔ پھر یہ لوگ راولپنڈی سے آئے تھے۔ ضرور دل میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ رکھتے ہوں گے اور انتقام لینے کی تاک میں ہوں گے۔ میں نے بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے کوارٹر کی طرف نہ جانے دیئے جائیں۔ پر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ چند روز بعد میں نے دیکھا کہ سردار کی چھوٹی لڑکی موہنی اور اُن کے پوتوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ یہ بچی جس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی، سچ مچ موہنی ہی تھی۔ گوری چٹی، اچھا ناک نقشہ، بڑی خوبصورت۔ سکھنی کی عورتیں کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ غلام رسول کہا کرتا تھا کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتوں کو چھوڑ جائیں تو پھر حوروں کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے پوتوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو میں اُن گھبیٹتا ہوا اندر لے آیا اور خوب پٹائی کی۔ پھر میرے سامنے کم سے کم اُن کی ہمت نہ ہوتی کہ اُدھر کا رُخ کریں۔

بہت جلد سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہو گئی۔ راولپنڈی سے تو ڈرپوکوں کی طرح پٹ کر بھاگ کر آئے تھے۔ پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو اقلیت میں پا کر اُن پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا — ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جامِ شہادت پینا پڑا۔ اسلامی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا۔ جب سے مغربی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں

دہلی میں آنے شروع ہوتے تھے۔ اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہوگیا تھا۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی۔ اس لئے میں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو ہوائی جہاز سے کراچی بھیجدیا۔ اور خود خدا پر بھروسہ کرکے ٹھہرا رہا۔ ہوائی جہاز میں سامان تو زیادہ نہیں جا سکتا تھا' اس لئے میں نے پوری ایک ویگن بک کرائی مگر جس دن سامان چڑھانے والے تھے اس دن سنا کہ پاکستان جانے والی گاڑیوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ اس لئے سامان گھر میں ہی پڑا رہا۔

۱۵/اگست کو آزادی کا جشن منایا گیا مگر مجھے اس آزادی میں کیا دلچسپی تھی۔ میں نے چھٹی منائی، اور دن بھر لیٹا ڈآن اور پاکستان ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا۔ دونوں میں نام نہاد ——— آزادی کے چیتھڑے اُڑائے گئے تھے اور ثابت کیا گیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش کی تھی۔ وہ تو ہمارے قائد اعظم کا اعجاز تھا کہ پاکستان لے کر ہی رہے۔ اگرچہ انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آکر امرتسر کو ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے' امرت سر خالص اسلامی شہر ہے اور یہاں کی سنہری مسجد جو (GOLDEN MOSQUE) کے نام سے دُنیا میں مشہور ہے...... نہیں وہ تو گُردوارہ ہے اور (GOLDEN TEMPLE) کہلاتا ہے۔ سنہری مسجد تو دہلی میں ہے۔ سنہری مسجد ہی نہیں' جامع مسجد بھی لال قلعہ ہے۔ نظام الدین اَولیا کا مزار' ہمایوں کا مقبرہ۔ صفدر جنگ کا مدرسہ۔ غرض کہ چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان، پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی آج اُسی دہلی بلکہ کہنا چاہیئے شاہ جہان آباد پر ہندو سامراج کا جھنڈا بلند کیا جا رہا تھا۔ " رو لے اب دِل کھول کے اے دیدۂ خونبار...... اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا کہ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا' تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا' ہم سے چھین لیا گیا تھا اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان جیسے اُجڈ اور غیر متمدن علاقے میں زبردستی بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں کسی کو شستہ اُردو زبان بھی بولنی نہیں آتی۔ جہاں شلوار جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے۔ جہاں ہلکی پھلکی پاؤ بھر میں بیس چپاتیوں کی بجائے دو دو سیر کی نانیں کھائی جاتی ہیں۔ پھر میں نے اپنے دِل کو مضبوط، کر کے قائد اعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہوگی مگر پھر بھی دلی چھوڑنے کے خیال سے دِل مُرجھایا ہی رہا...... شام کو جب میں باہر نکلا اور سردار جی نے دانت نکال کر کہا "کیوں بابو جی! تم نے آج کچھ خوشی نہیں منائی؟" تو میرے جی میں آئی کہ اُس کی داڑھی میں آگ لگا دوں۔ ہندوستان کی آزادی اور دِل میں سکھا شاہی آخر رنگ لا کر ہی رہی۔ اب مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ریفیوجیز (REFUGEES) کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کے لئے اپنے گھر بار چھوڑ کر' وہاں سے بھاگے تھے۔ یہاں آکر گلی کوچوں میں اپنا رونا روتے پھرتے تھے۔ کانگریسی پراپیگنڈا مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا اور اس بار کانگریسیوں

نے چال یہ چلی کہ بجائے کانگریس کے نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ یہ ہندو چاہے کانگریسی ہوں یا مہاسبھائی، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاہے دُنیا کو دکھانے کی خاطر وہ بظاہر گاندھی اور جواہر لال نہرو کو گالیاں ہی کیوں نہ دیتے ہوں۔

ایک دن صبح کو خبر آئی کہ دہلی میں قتلِ عام شروع ہو گیا۔ قرول باغ میں مسلمانوں کے سیکڑوں گھر پھونک دیئے گئے۔ چاندنی چوک کے مسلمانوں کی دو کانیں لوٹ لی گئیں اور ہزاروں کا صفایا ہو گیا۔ یہ تھا کانگریس کے ہندو راج کا نمونہ۔ خیر میں نے سوچا نئی دہلی تو مدت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے۔ لارڈ ماونٹ بیٹن یہاں رہتے ہیں۔ کمانڈر انچیف یہاں رہتا ہے۔ کم سے کم یہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہونے دیں گے۔ یہ سوچ کر میں دفتر کی طرف چلا۔ کیونکہ اُس دن مجھے پراوڈنٹ فنڈ کا حساب کرنا تھا اور دراصل اسی لئے میں نے پاکستان جانے میں دیر کی تھی۔ ابھی گول مارکیٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا۔ اُس نے کہا "یہ کیا کر رہے ہو۔ جاؤ واپس جاؤ۔ باہر نہ نکلنا۔ کناٹ پلیس میں بلوائی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ میں واپس بھاگ آیا۔

اپنے اسکوائر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مُڈبھیڑ ہو گئی۔ کہنے لگے۔ شیخ جی فکر نہ کرنا۔ جب تک ہم سلامت ہیں تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" میں نے سوچا اس کی داڑھی کے پیچھے کتنا مکر چھپا ہوا ہے۔ دل میں تو خوش ہے۔ چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا ہے..... مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے بلکہ شاید مجھے چڑھانے کے لئے یہ کہہ رہا ہے۔ کیونکہ سارے اسکوائر میں بلکہ تمام سڑک پر میں تنِ تنہا مسلمان تھا۔

پر مجھے اِن کافروں کا رحم و کرم نہیں چاہیئے۔ میں سوچ کر اپنے کوارٹر میں آگیا۔ میں مارا بھی جاؤں گا تو دس بیس کو مار کر۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے، میری دونالی شکاری بندوق رکھی تھی۔ جب سے فسادات شروع ہوئے تھے۔ میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا۔ اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

"کیوں حضور! کیا ڈھونڈھ رہے ہیں آپ؟"

"یہ میرا وفادار ملازم محمد تھا۔"

"میری بندوق کیا ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اُسے معلوم ہے۔ شاید اس نے چھپائی ہے، یا چُرائی ہے۔"

"بولتا کیوں نہیں،" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

تب حقیقت معلوم ہوئی کہ محمد نے میری بندوق چُرا کر اپنے چند دوستوں کو دیدی تھی، جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

"کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں، دس ریوالور اور ایک توپ۔ کافروں کو بھون کر رکھدیں گے۔ بھون کر"

میں نے کہا "دریا گنج میں میری بندوق سے کافروں کو بھون دیا گیا تو اس میں میری حفاظت کیسے ہوگی۔ میں تو یہاں ہنتا کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھون دیا گیا تو کون ذمّے دار ہوگا؟" میں نے محمد سے کہا۔

وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لیکر آتے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کی تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے کہ اب اُن سے کبھی ملاقات ہوگی بھی یا نہیں لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ کاش میں نے پراویڈنٹ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔

ست سری اکال۔۔۔۔ ہر ہر مہادیو"

دُور سے آوازیں قریب آرہی تھیں۔ یہ بلوائی تھے۔ یہ میری موت کے ہرکارے تھے۔ میں نے زخمی ہرن کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔ جو گولی کھا چکا ہو اور جس کے پیچھے شکاری کتّے لگے ہوں۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے اور اُن میں شیشے لگے ہوتے تھے۔ اگر میں بند ہو کر بیٹھ بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آسکتے تھے "ست سری اکال۔ ہر ہر مہادیو۔"

آوازیں اور قریب آرہی تھیں۔ میری موت قریب آرہی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوتے۔ "شیخ جی! تم ہمارے کوارٹر میں آجاؤ۔ جلدی کرو۔" بغیر سوچے سمجھے اگلے لمحے میں سردار جی کے برآمدے کی چکوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سن سے میرے سر پر سے گذر گئی۔ کیونکہ میں وہاں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک لاری آکر رُکی اور اس میں سے دس پندرہ نوجوان اُترے۔ اُن کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ کوارٹر ۸۔ شیخ برہان الدین۔ اُس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا اور یہ غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گرہستی کی دُنیا میری آنکھوں کے سامنے اُجڑ گئی۔ لٹ گئی۔ کرسیاں، میزیں، صندوق، تصویر۔ کتابیں، دریاں قالین، یہاں تک کہ میلے کپڑے ہر چیز لاری پر پہنچا دی گئی۔

ڈاکو!
لٹیرے!!
قزاق!!!
اور یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے یہاں لے آئے تھے۔ یہ کون سے کم لٹیرے تھے؟ باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے "ٹھیریئے صاحب۔ اس گھر پر ہمارا حق زیادہ ہے۔ ہمیں بھی اس لوٹ میں حصہ ملنا چاہیئے اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اشارہ کیا اور وہ بھی لوٹ میں شامل ہو گئے۔ کوئی میری پتلون اٹھائے چلا آرہا ہے۔ کوٹ سوٹ کیس، کوئی میری بیوی بچوں کی تصویریں بھی لا رہا ہے اور یہ سب مال غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا رے سردار! زندہ رہا تو تجھ سے بھی سمجھوں گا۔ پر اس وقت تو میں چوں بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فسادی جو سب کے سب مسلح تھے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ اگر انھیں کہیں معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں.....

"ارے اندر آؤ تو سی!"

دفعتاً میں نے دیکھا کہ سردار جی ننگی کرپان ہاتھ میں لئے مجھے اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے ایک بار اس ڈھیل چہرے کو دیکھا جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہو گیا تھا اور پھر کرپان کو جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوتِ موت دے رہی تھی، بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے سن لیا تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہو گی۔ کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا۔ میں نے سوچا ان دس بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر ہے۔ میں کمرے میں چلا گیا جھجکتا ہوا خاموش۔

"اِتھے نہیں۔ اوس اندر آؤ۔"

میں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے۔ میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چوندھیاتی جا رہی تھی۔

"یہ لو جی۔ اپنی چیزیں سنبھال لو" یہ کہہ کر سردار جی نے وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا جو انھوں نے اور اُن کے بچوں نے جھوٹ موٹ کی لوٹ میں حاصل کیا تھا۔

سردارنی بولی "بیٹا ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اتنے میں باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے اور اُس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کی چابیاں مل جاتیں تو سب معاملہ آسان ہو جاتا۔

"چابیاں تو اس کی پاکستان میں ملیں گی۔ بھاگ گیا نہ ڈرپوک کہیں کا۔ مسلمان کا بچہ تھا تو مقابلہ کرتا ــــ"

ننھی موہنی میری بیوی کے چند ریشمی قمیص اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اُس نے یہ سُنا۔ وہ بولی "تم بڑے بہادر ہو! شیخ جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے۔ وہ تو کوئی بھی پاکستان نہیں گئے۔"

"نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منہ کالا کر گیا۔"

"مُنہ کالا کیوں کرتے وہ تو ہمارے ہاں ......."

میرے دل کی حرکت ایک لمحے کے لئے بند ہو گئی۔ بچی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہو گئی۔ مگر ان بلوائیوں کے لئے یہی کافی تھا۔

سردار جی پر جیسے خون سوار ہو گیا۔ انھوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی اور خود باہر نکل گئے۔ باہر کیا ہوا یہ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہ ہوا۔ تھپڑوں کی آواز ــــ پھر موہنی کے رونے کی آواز اور اس کے بعد سردار جی کی آواز۔ پنجابی گالیاں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں۔ میں چاروں طرف سے بند تھا۔ اس لئے ٹھیک سُنائی نہ دیتا تھا۔

اور پھر ــــ گولی چلنے کی آواز ــــ سردارنی کی چیخ ــ

لاری روانہ ہونے کی گڑگڑاہٹ اور پھر تمام اسکوائر پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے اور اُن کے سینے کے قریب۔ سفید قمیص خون سے سُرخ ہو رہی تھی۔ اُن کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر رہا تھا۔

سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟ میری زبان سے نہ جانے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا خیالات، محسوسات، تعصبات کی دُنیا کھنڈر ہو گئی تھی۔

"سردار جی یہ تم نے کیا کیا؟"

"مجھے کرجا اُتارنا تھا بیٹا!"

"قرضہ؟"

"ہاں! راول پنڈی میں تمہارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور راحت بچائی تھی۔"

"کیا نام تھا اُس کا سردار جی؟"

"گلام رسُول۔"

"غلام رسول!"

اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکہ کیا ہو۔ دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے۔ ایک..... دو..... تین..... چار..... پانچ.....

سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف پھر گئیں جیسے مسکرا رہے ہوں اور مجھے اپنے دادا یاد آ گئے جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔ سردار جی کی شکل ان سے کتنی ملتی تھی۔ چھ..... سات..... آٹھ..... نو.....

جیسے وہ ہنس رہے ہوں، اُن کی سفید داڑھی اور سر کے کھلے ہوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نوراتی ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔

دس..... گیارہ..... بارہ

جیسے وہ کہہ رہے ہوں "جی اساں وے ہاں تو چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔

پھر وہ نگاہیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز دور سے بہت دُور سے آئی۔ میں کہتا تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے اور یہ کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ اب اِن سردار جی ہی کو دیکھو نا ——— ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دیدی۔

پر یہ سردار جی نہیں مرے تھے۔ میں مرا تھا!

# سلمیٰ اور سمندر

"سلمیٰ"۔

"ہوں ـــ"

"خوش ہو ـــ؟"

"ہوں۔"

"کتنی خوش ہو؟"

"اتنی خوش ہوں ،۔۔۔۔ اتنی خوش ہوں ۔۔۔ کہ بتا نہیں سکتی۔

اور بڑی بڑی کالی آنکھیں جو کاجل کی غیر ضروری لکیروں کے بغیر بھی بہت خوبصورت تھیں' آہستہ آہستہ پلکوں کے پردے میں چھپ گئیں۔ جیسے غلافی پپوٹے اتنی محبت' اتنی مسرت کا بوجھ نہ سنبھال پاتے ہوں۔

(" ایشیائی آنکھیں" جن کے بارے میں ایک نوجوان انگریز شاعر نے ایک " سانیٹ" لکھا تھا۔ جہاندیدہ آنکھیں جنھوں نے لندن کا ویسٹ منسٹر اور روم کا بینٹ ہال اور پیرس میں سونانی زاور قاہرہ کے اہرام مصر اور نیویارک کے فلک بوس سکائی سکریپر دیکھے تھے مگر جن میں محبت کی میٹھی آگ آج پہلی بار بھڑکی تھی۔

انور نے جھک کر اپنی بیوی کی بند آنکھوں کو چوم لیا۔

سلمہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بڑے ہی خوبصورت اور میٹھے اور سُریلے احساس کی نرم نرم لہریں اُس کے اُوپر سے گزر رہی ہیں۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی ہستی کو اس احساس کے سپرد کر رہی ہے۔ وہ نرم نرم لہریں اُس پر سے گزر رہی ہیں۔ وہ ان میں ڈوب رہی ہے، وہ ان میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔

نرم نرم لہریں، اس کے تخیل کے کسی کونے میں، جہاں شعور اور لاشعور کی سرحدیں ملتی ہیں، ایک عجیب سی موسیقی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ جیسے شہد کی مکھیاں بھیرویں کا الاپ گنگنا رہی ہوں — نہیں یہ شہد کی مکھیاں نہیں۔ یہ بھڑیں ہیں۔ لاکھوں بھڑوں کی اُفق تک پھیلی ہوئی لہر اور اُن کے ڈنکوں کے میٹھے زہر میں وہ ڈوب رہی ہے اور ڈوب جانا چاہتی ہے۔ مر رہی ہے اور مر جانا چاہتی ہے۔

اور پھر ایک مدھم شور، ماضی کے افق سے سرسراتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہروں کا شور، نرم نرم ریت پر متواتر پانی کی محبت بھری مار کا شور۔ مگر دیرینہ محبت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی عورت یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ شور اُن کے مکان کے باہر ہے یا خود اُس کے مَن کے اندر ہے۔ شاید یہ میرے برانگیختہ دماغ کا واہمہ ہے۔ اُس نے سوچا۔ شاید میرے عمر بھر کے خوف اور خدشے اس غلیم اور عمیق مسرت کے لمحے میں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لئے یہ شور کر رہے ہیں۔ میں آج ان کی آواز نہیں سنوں گی۔ میں اِن سے نہیں ڈروں گی، نہیں ڈروں گی، نہیں ڈروں گی۔ ۔ ۔ ۔

اس کے دل کی دھڑکن کی لَے تیز ہو رہی تھی — نہیں سنوں گی، نہیں ڈروں گی، نہیں سنوں گی، نہیں ڈروں گی۔ مگر سمندر کی طوفانی لہروں کی لَے بھی اتنی ہی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ لہریں نرم ریت ہی پر نہیں پھیل رہی تھیں، اب وہ چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اُن کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب وہ لہریں خود اُن کے مکان کی دیواروں پر دستک دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں سمندر — اُس کا پُرانا دشمن — جو کب سے اُس کی جان کے درپے تھا، اس کمرے میں آن پہنچے گا اور سلمہ کو، اس کے شوہر اور اُن کے مسرت بھرے اس لمحے کو بہا کر لے جائے گا اور اُن کا گلا گھونٹ کر اپنی ہیبت ناک کالی گہرائی میں ہمیشہ کے لئے سُلا دے گا۔

محبت اور مسرت کے لمحے کی گہرائی سے سلمہ کی چیخ نیم اندھیرے کمرے میں گونجی اور پھر لہروں کے شور میں کھو گئی۔

"سلمہ! میری جان! کیا ہوا؟ ڈر گئیں —؟"

انور نے سرہانے رکھے ہوئے لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی کی اور اُس نے دیکھا کہ سلمہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ اُس کی پیشانی پسینے سے چمک رہی ہے اور اُس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے ہیں، اور اس نے ان تھرتھراتے ہوئے نرم اور نازک چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا تو

وہ ایسے لگے جیسے دو سہمے ہوئے کبوتر کے بچوں نے باز سے ڈر کر ماں کے پروں میں پناہ لے لی ہو....

(انور نے سوچا کتنے ملائم، کتنے نازک ہیں سلمہ کے ہاتھ۔ ان ہاتھوں نے کبھی ترکاری نہیں چھیلی، کبھی مسالہ نہیں پیسا، کبھی بالوں کے پلنگ نہیں بُنے، کبھی برتن نہیں مانجھے، کبھی کپڑے نہیں دھوئے۔ ان ہاتھوں نے تو پارکر اور شیفر قلم سے فلسفے کے لیکچر نوٹ ہی لکھے ہیں۔ یہ ہاتھ صرف پیانو کے پردوں پر ہی پڑے ہیں۔ ان کی انگلیاں کبھی ستار کی مضراب سے زخمی نہیں ہوئیں۔)

(اور سلمہ نے سوچا انور اتنا بڑا ڈاکٹر ہے لیکن اس کے ہاتھ تو ایسے مضبوط اور کھُردرے ہیں، جیسے کسی لوہار کے ہوں، کسی کانکن یا سڑک کوٹنے والے کے۔ اگر جب اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے اندھیرے میں انور سے ہاتھ ملایا ہوتا اور اُس کے حساس چہرے کی نرم مسکراہٹ نہ دیکھی ہوتی۔ اس کی ہمدردی میں رچی ہوئی آواز نہ سُنی ہوتی۔ اُس کے سلجھے ہوئے دماغ کی تلوار جیسی کاٹ کا زخم نہ کھایا ہوتا۔ تو وہ کبھی ایسے غیر شاعرانہ ہاتھوں میں اپنی زندگی اور محبت نہ سونپتی! مگر کتنی پُریقین محبت تھی ان سخت ہاتھوں کی گرمی میں۔ کتنی پُرسکون عافیت، کتنا پُرخلوص انداز اور عہد)

ٹھنڈے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ٹھہر گئی۔ دھڑ دھڑ کرتے ہوئے دل کی لے پُرسکون ہوتی گئی، اور انور کی آواز سلمہ کو ایسے لگی جیسے زخم پر کوئی پھایہ رکھ دے (کیوں نہ ہو۔ اس نے سوچا۔ میرا شوہر ڈاکٹر جو ہے)

"کیا ہوا؟ کوئی ڈراونا خواب دیکھا تھا کیا؟"

"خواب نہیں۔ سمندر۔"

"سمندر؟"

"ہاں۔ سمندر مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"لہروں کے شور سے ڈر گئیں؟ تم سچ مچ بچی ہو!"

(سلمہ نے سوچا انور میری جان۔ میرے پیارے شوہر۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تب ہی تو میں نے نہ جانے کتنے رقیبوں، کتنی پتیوں، کرنیلوں، ادیبوں اور شاعروں کو چھوڑ کر تم سے شادی کی ہے۔ مگر خدا کے لئے مجھے "بچی" نہ کہا کرو۔ مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ میں بچی نہیں ہوں۔ میری عمر تیس برس ہے۔ میں نے کیمبرج سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ میں اکیلی ساری دُنیا گھوم چکی ہوں۔ میں نے بین الاقوامی شہرت کے عظیم ترین فلسفیوں کی کانفرنس میں شرکت کی ہے۔ میری تقریر سُن کر ایک جرمن فلسفی نے مجھ سے کہا تھا کہ "تم ایشیائی نوجوانوں کے دماغ کتنے سنجیدہ پُرسکون اور سُلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ تمہارے مقابلے میں ہمارے نوجوان فلسفی تو ضدی بچے لگتے ہیں۔" میں دُنیا کے بڑے بڑے دانشوروں، ادیبوں اور فلسفیوں اور آرٹسٹوں سے مل چکی ہوں۔

اور اُن میں سے ہر ایک سے اس ہی دماغی سطح پر بات چیت کی ہے اور تم مجھے "بچی" کہتے ہو۔ اور جس طرح تم مجھے "بچی" کہتے ہو، اُس میں مجھے مذاق کا نہیں رحم اور ہمدردی کا جذبہ معلوم ہوتا ہے، بلکہ ہلکی سی حقارت کا شبہہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے تمہاری رائے میں میں کم فہم ہوں۔ ناتجربہ کار ہوں، ——— ضدی ہوں۔)

مکان کے باہر اور خود سلمہ کے من کے اندر لہروں کا شور بڑھتا ہی رہا۔

"انور! مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"جو تم کہو ———"

"وعدہ کرو کہ یہ مکان چھوڑ دو گے۔ سمندر کے اتنے قریب میں نہیں رہ سکتی۔"

"میری جان! تو دوسرا مکان تلاش کریں گے۔ لیکن سمندر سے تمہیں اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"مجھے سمندر سے ڈر لگتا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس مجھے سمندر کے خیال ہی سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔"

"بڑی ہی عجیب بات ہے"

مکان کے باہر اور اس کے مَن کے اندر سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ سلمہ کا منہ چڑا رہی تھیں۔ "تم ہم سے بچنے کے لئے اپنے شوہر کی آغوش محبت میں چھپ جانا چاہتی تھیں نا۔ مگر ہم نے تمہیں وہاں بھی ڈھونڈ نکالا۔ تم ہم سے نہیں بچ سکتیں۔ نہیں بچ سکتیں، نہیں بچ سکتیں۔ ہم تمہارے شوہر کو بھی تم سے چھین لیں گے۔ ہم تم دونوں کی محبت کا گلا گھونٹ دیں گے۔ سمندر کی طاقت بے پناہ ہے۔"

(اور انور سوچ رہا تھا "سلمہ بہت حسین ہے۔ بہت ذہین ہے، بہت اچھی ہے۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت جو میں نے آج تک کسی سے نہیں کی۔ لیکن کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ سکیں گے؟ مجھے سمندر کے قریب رہنا اتنا پسند ہے اور اُسے سمندر کی آواز سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لاڈ پیار میں پلی ہوئی امیر لڑکیوں کو زیادہ ہی ڈر لگتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ وہ سر عظیم اللہ کی بیٹی ہے جو ہائی کورٹ کے جج تھے اور جنھوں نے لاکھوں روپے بیرسٹری سے کمائے تھے جنھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو انگریز نرسیں رکھ کر پالا تھا اور بچپن ہی سے اُسے انگلستان کے اسکولوں میں اور پھر کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم دلوائی تھی۔ سلمہ میں سب اچھائیاں ہیں۔ وہ مجھ سے محبت بھی کرتی

ہے لیکن اس کا خاندانی ماحول مجھ سے کتنا مختلف ہے۔ وہ سنگِ مرمر کے فرش اور سنگِ سیاہ کے ستونوں والی محل نما عظیم منزل میں پیدا ہوئی اور میں پیدا ہوا راجہ صاحب مکرم پور تعلقہ دار کے ہاتھی کے اصطبل میں۔ وہ بچپن میں کھیلی انگریز کمشنر صاحب کے بچوں کے ساتھ اور میں کھیلا راجہ صاحب کے سائیسوں، پالکی برداروں، کہاروں کے بچوں کے ساتھ۔" اور اپنا بچپن یاد کر کے وہ آپ سے آپ مسکرایا۔)

"کیوں، کیا سوچ کر مسکرا رہے ہو؟" سلمہ نے انور کے بازو پر سر رکھے ہوئے نظر اٹھا کر پوچھا۔

"میں سمندر سے ڈرتی ہوں، اسی لئے تم مجھے بے وقوف اور ڈرپوک سمجھتے ہو نا؟ شاید تم مجھے پاگل بھی سمجھتے ہو؟ شاید تم سوچتے ہو ایک دن اس پگلی کے دماغ کا آپریشن کرنا پڑے گا۔"

"نہیں میری جان!"

اس نے سلمہ کے گھونگریالے کٹے ہوئے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔"

اور وہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بدستور رہی۔

(وہ سوچ رہا تھا۔ "میں بھی تم سے کم تھوڑا ہی ہوں۔ تم نے بچپن میں مسوری اور نینی تال میں گھوڑے کی سواری کی ہے تو میں نے ہاتھی کی سواری کی ہے۔ جب تمہارے بابا ولایت میں بیرسٹری پڑھنے کے لئے گئے ہوتے تھے اِن دنوں میں کر بابا راجہ صاحب کے مہاوت تھے۔ اُن کی ہتھنی لکشمی اور اس کے بچے راجہ کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ راجہ کی اور میری ایک ہی عمر تھی۔ جب میں گڈ لیاں چلتا تھا۔ اس وقت سے میں اصطبل میں اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو میرے بابا مہاوت رمضان علی اپنی پیلی پگڑی باندھ کر لکشمی کو راجہ صاحب کی سواری کے لئے تیار کرتے، سنہری جھول پہناتے، چاندی لگا ہودہ کستے۔ تو میں بھی کود کر راجہ پر سوار ہو جاتا اور بالکل جیسے بابا لکشمی کو لوہے کے انکش سے گود کر چلاتے، میں بھی ایک نیم کی ٹہنی کو توڑ کر راجہ کے ماتھے میں چبھوتا اور کہتا "چل رے ہاتھی کے بچے، چل چل چل"۔۔۔ پھر کسی دُکھ بھری یاد نے اس کی مسکراہٹ کو اُس کے چہرے سے سمیٹ لیا اور انور کی سانولی مگر شفاف پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔

(سلمہ نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں اپنے شوہر کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں اور برابر سوچ رہی تھی " اپنے خیالات میں کھو کر نہ جانے یہ کہاں چلے جاتے ہیں۔ مجھ سے دُور، بہت دُور، شاید اپنے ماضی میں، جس کے بارے میں کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں تمہیں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ مگر میں ماضی سے ڈرتی ہوں۔ اپنے ماضی سے بھی اور اُن کے ماضی سے بھی۔ اس پُراسرار تہہ خانے کا دروازہ بند ہی رہے تو بہتر ہے۔ ایک بار کھُل گیا تو نہ جانے ماضی کی کیسی کیسی یادوں کے جن اور بھوت آزاد ہو کر ہماری خوشی اور

محبت کو تہ و بالا کر دیں۔ نہیں، انور پیارے۔ میں تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتی۔" مگر پھر اس عورت نے جو کیمبرج کی پڑھی ہوئی یونانی فلسفہ کی ماہر کے لاشعور میں چھپی بیٹھی تھی۔ اس کے کان میں کُس پُسایا۔ "ہو سکتا ہے یہ کسی اور عورت کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ شاید کوئی ڈاکٹرنی جو اُن کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہو۔ شاید کوئی ہسپتال کی نرس۔ یہ نرسیں بھی تو بعض بڑی حسین ہوتی ہیں اور پھر انہوں نے تو ایڈنبرا میں بھی پڑھا ہے۔ وہاں ضرور کسی بھورے بالوں والی انگریز یا سکاٹ لڑکی سے معاشقہ کیا ہوگا۔ اس وقت انہیں اس کی یاد تو نہیں آ رہی؟")

(انور سوچ رہا تھا کہ زندگی کے واقعات کا تسلسل بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ آج سے پچیس برس پہلے اگر اس دن لکشمی نے مست ہو کر راجہ صاحب کے بڑے لڑکے راجندر کا رُخ نہ کیا ہوتا، جو فیل خانے کے باہر کرکٹ کھیل رہا تھا۔ اگر انور کے بابا رمضان علی مہاوت نے راجندر کی جان بچانے کے لئے اپنی جان نہ دی ہوتی، اگر راجہ صاحب نے یتیم انور سے یہ نہ پوچھا ہوتا! کیوں بیٹا تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اور اگر نو برس کے بچے نے نہ جانے کیسے یہ نہ کہا ہوتا کہ 'راجہ صاحب میں تو پڑھنا چاہتا ہوں'، تو آج وہ کسی سرکس میں ہاتھیوں کی دیکھ بھال کرتا ہوتا۔ یا کسی اصطبل میں، کسی سیٹھ کے ریس کے گھوڑوں کی مالش کرتا ہوتا اور اس کی ایک تھکی ہوئی مُرجھلائے ہوئے جسم کی بیوی ہوتی اور آدھی درجن بچے ہوتے اور حسین سلمہ کا سر آج کسی اور ہی کی آغوش میں ہوتا۔ مگر راجہ صاحب نے مرتے ہوئے مہاوت سے اپنا وعدہ پورا کیا تھا اور انور اسکول سے کالج، کالج سے میڈیکل۔ کالج اور میڈیکل کالج سے ایڈنبرا یونیورسٹی اور لندن کے ہسپتالوں تک ہو آیا تھا۔ اب اس کا شمار ملک کے بہترین نوجوان سرجنوں میں ہوتا تھا مگر لوگ سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر انور علی کے دماغ کا کوئی سکرو ڈھیلا ہے کہ ہزاروں روپے کی پریکٹس کرنے کی بجائے سرکاری ہسپتال میں سات سو روپے ماہوار پر جنرل وارڈ میں پڑے ہوئے مریضوں کے مُفت آپریشن کرتا ہے۔

(اور ایک دن اس ہسپتال میں اُس کے پاس سلمہ آئی تھی اپنڈکس کا آپریشن کرانے اور اُس نے کہا تھا میں تو اس آپریشن کے لئے ویٹینریا یا جنیوا یا لندن جانے والی تھی، مگر گورنمنٹ ایکسچینج نہیں دیتی۔ آپ کی بڑی تعریف سُنی ہے کہ آپ اپنڈکس کا آپریشن کرتے ہیں تو چوتھے دن مریض خود چل کر گھر چلے جاتے ہیں۔ تو جس نرسنگ ہوم میں آپ کہیں، میں داخلہ لے لوں، اور ڈاکٹر انور علی نے اُسے بتایا تھا کہ اگر مجھ سے آپ کو آپریشن کرانا ہے تو آپ کو اسی گورنمنٹ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں داخلہ لینا ہوگا اور سر عظیم اللہ مرحوم کی نفاست پسند اور نازک مزاج بیٹی جنرل وارڈ کے خیال ہی سے کانپ اُٹھی تھی اور اُس نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ میں مر بھی جاؤں گی لیکن ان گندی مزدورنوں اور بھنگنوں کے ساتھ جنرل وارڈ میں نہیں رہوں گی۔ پھر بھی ڈاکٹر انور علی سے معائنہ کروانے میں کوئی،

ہرج نہیں اور جب معائنے کے دوران میں انور کی سخت کھُردری ڈاکٹری انگلیوں نے سلمہ کے پیٹ کو چھُوا تھا تو اُن کے درد آشنا لمس میں ایسی عجیب ٹھنڈک، ایسی عجیب تسکین اور شفا تھی کہ سلمہ نے فیصلہ کرلیا کہ اب آپریشن کرواؤں گی تو اسی ڈاکٹر سے۔

اور سو وہ آپریشن کی میز پر لیٹی تھی اور کلوروفارم کے اثر سے بے ہوش ہونے سے پہلے اُس نے دیکھا کہ ڈاکٹر انور علی کی آنکھیں سرجن کی سفید نقاب میں سے مسکرا رہی ہیں اور یہ دیکھ کر اُس نے اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور پھر کلوروفام کے بادل اُس کے شعور پر چھا گئے تھے مگر ان بادلوں میں بھی وہ مُسکراتی ہوئی آنکھیں اس کو گھور رہی تھیں۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ جنرل وارڈ میں اُنہی دوسری مریض عورتوں کے درمیان پڑی تھی اور اس کے برابر والی بیڈ کے چاروں طرف پہیوں والی سفید پردے دار دیواروں کو کھڑا کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ ایک بُڑھیا بھکارن جو کسی کی موٹر کے نیچے آگئی تھی، چل بسی تھی اور دوسری طرف ایک نوجوان مزدورنی جس کے شوہر نے جوش رقابت میں اس کی ناک کاٹ لی تھی، اُس شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اُسے تسلی دیتی رہی تھی ـــــ اور تین دن تک اس ماحول میں وہ پڑی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ ڈاکٹر انور علی اُسے دیکھنے آئے گا۔ مگر دُوسرے جونیئر ڈاکٹر آتے رہے اور وہ نہیں آیا کیونکہ سُنا تھا کہ وہ کئی بڑے نازک دل کے آپریشن کر رہا ہے۔ پھر چوتھے دن وہ آیا تھا اور اس نے سلمہ کو ڈانٹ کر کہا تھا" یہ کیا پلنگ پر کیوں لیٹی ہو۔ اُٹھو اور وارڈ کے اس کونے تک چل کر جاؤ۔ سلمہ نے کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب! میں کیسے چل سکتی ہوں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری ٹانگوں میں دم ہی نہیں ہے۔ چلنا تو کیا۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جائے گا اور ڈاکٹر نے کہا تھا یہ سب بکواس ہے۔ چلو اٹھو۔" اور اس کے بولنے کے انداز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سلمہ سچ مُچ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے ہوتے وارڈ کے کنارے تک چلی گئی اور وہاں سے بلا سہارے واپس بھی آگئی تھی لیکن جیسے ہی وہ ڈاکٹر کے قریب آئی اس کو اپنی ٹانگوں میں دفعتاً لڑکھڑاہٹ اور کمزوری محسوس محسوس ہوئی اور وہ چکرا کر گرنے ہی والی تھی کہ انور نے اُسے سنبھال لیا اور سلمہ کو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی میں اُسے سہارا دینے والے ہاتھ یہی ہیں۔ دو ہفتے بعد اُن کی شادی ہوگئی تھی اور انور بیوی کو اپنے چھوٹے سے نئے مکان میں لے آیا تھا جو اُس نے کئی ہزار روپے قرض لے کر بالکل سمندر کے کنارے خریدا تھا، مگر اس وقت اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سمندر کی قُربت سلمہ کے لئے اتنی بڑی سوہانِ روح ثابت ہوگی۔)

"مگر کیوں؟" اُس نے پوچھا سلمہ سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔

"کیوں کیا؟"

" سمندر سے تم کیوں ڈرتی ہو؟"

اور اسی وقت اُن کے گھر کے باہر سمندر کے کنارے بنے ہوئے پتھروں کے بند سے ایک لہر اتنے زور سے آکر ٹکرائی کہ سلمہ اُچھل پڑی۔

"میں نے کہا نہ کہ کوئی خاص وجہ نہیں ہے ـــــ بس ڈر لگتا ہے۔"

"کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے۔ کیا تم نے کبھی کسی سائیکاٹرسٹ سے بات کی ہے؟"

"ہاں جب میں کیمبرج میں پڑھتی تھی۔ ایک نوجوان انگریز سائیکاٹرسٹ جارج رسل نے میرا نفسیاتی معائنہ کیا تھا۔"

"اور اس کی کیا رائے تھی؟"

"اس کا کہنا تھا کہ لاشعور کی دنیا میں سمندر سمبل (علامت) ہے جنسی فعل کی اور اس کا خیال تھا کہ ضرورت سے زیادہ شریفانہ ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے میں اس قدرتی فعل سے خائف ہوں۔ اور اس لئے سمندر سے ڈرتی ہوں۔"

"اور کیا یہ سچ تھا؟"

"نہیں وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ خود مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیوں؟"

"وہ بہت خوبصورت تھا۔ سنہری گھونگھریالے بال تھے۔ اس کے۔ باتیں بھی بڑی اچھی کرتا تھا۔ مگر ـــــ"

"مگر ـــــ؟"

"مگر شراب اور سگریٹ بہت پیتا تھا۔ اس کے دانت پیلے اور گندے تھے اور اس کے منہ سے پائیریا کی بو آتی تھی۔"

"اور کسی سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"کوئی پسند نہیں آیا۔ کسی سے محبت کر سکتی تھی لیکن اس کی عزت نہیں کر سکتی تھی۔ کسی کی عزت کر سکتی تھی مگر محبت نہیں کر سکتی تھی۔ جب مجھے ایسا آدمی مل گیا جس سے میں محبت بھی کر سکتی ہوں، اور اس کی عزت بھی کر سکتی ہوں تو اس سے شادی کر لی۔ بس اتنی حقیقت ہے میری نفسیاتی الجھنوں کی ـــ"

"لیکن سمندر سے ڈر ـــــ یہ بھی تو ایک نفسیاتی الجھن ہے۔"

"ہوگی ـــــ مگر اب مہربانی کر کے سمندر کا ذکر مت کرو۔ کوئی اور بات کرو۔"

"تو سنو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں سلمہ۔ اگر میں ڈاکٹر نہیں شاعر ہوتا، تو خوبصورت الفاظ میں تمہیں بتاتا، کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔"

"اور ہماری محبت میں کبھی کوئی حائل نہیں ہوگا ـــ ؟" سلمی نے پوچھا۔ اور اس کے ذہن میں وہ لمحے تھے، جب انور نہ جانے کن خیالات میں کھو جاتا تھا۔

"نہیں میری جان۔ دنیا میں کوئی ہماری محبت میں حائل نہیں ہو سکتا۔"

اور اسی وقت گڑگڑاتی، بھنکارتی، چنگھاڑتی ایک لہر آئی اور اتنے زور سے بند سے ٹکرائی کہ سارا مکان ہل گیا اور چھینٹے اُن کی کھڑکیوں تک پر پڑے۔

سلمہ کا چہرہ ایک بار پھر پیلا پڑ گیا۔

"انور ـــ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے شوہر کی آغوش میں بچوں کی طرح منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

انور نے اپنے سینے پر گرم گرم آنسوؤں کو محسوس کیا۔ سلمہ رو رہی تھی۔

"میری پیاری۔ میری جان۔" وہ کہے جا رہا تھا لیکن اس کا ڈاکٹری دماغ اس عجیب و غریب خوف کی تشخیص کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باہر سمندر غرا رہا تھا۔ چنگھاڑ رہا تھا دھاڑ رہا تھا۔ ایک بپھرے ہوئے دیو کی مانند۔

اندر سلمہ خوف سے کانپ رہی تھی بلک ـــ بلک کر رو رہی تھی۔ ایک سہمی ہوئی بچی کی طرح۔

دیو غراتا رہا۔ چنگھاڑتا رہا، دہاڑتا رہا۔

بچی کانپتی رہی، روتی رہی۔ سسکیاں بھرتی رہی۔

یہاں تک کہ سمندر تھک کر ساحل سے لوٹ گیا۔

یہاں تک کہ بچی روتے روتے سو گئی مگر سوتے سوتے بھی وہ سسکیاں بھرتی رہی شاید خواب میں بھی وہ ڈر رہی تھی۔

## (تشخیص)

بچی جہاز کی ڈیک پر کٹہرے کے سہارے کھڑی لہروں کو گن رہی تھی، جو جہاز سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔

"ایک۔ دو۔ تین، چار، پانچ۔"

ایک لہر کے بعد دوسری ـــ ہر لہر پانی ہی کی بنی ہوئی تھی لیکن ہر لہر ایک دوسری سے مختلف تھی۔ کوئی اونچی، کوئی نیچی، کوئی مچھلی کی طرح سڈول، کسی کا اونٹ کی طرح کوہان نکلا ہوا، کوئی رینگتی ہوئی آتی تھی، کوئی دوڑتی ہوئی، کوئی جھاگوں سے بنا لیس کا سفید دوپٹہ اوڑھے۔ کوئی مس میری کی طرح نیلا فراک پہنے تھی تو کسی پر سورج کی روشنی سے ستارے جگمگا رہے تھے جیسے اماں کے کامدانی کے دوپٹے پر۔

"چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ۔"

بچی سوچ رہی تھی کہ اتنی بہت سی لہروں کو اللہ میاں کونسے اصطبل میں رکھتے ہوں گے۔ ہمارے گھر میں تو تین گھوڑے ہیں۔ ایک جو فٹن میں جوتا جاتا ہے اور دو جو سواری میں آتے ہیں اور اُن کے لئے تین ہی اصطبل الگ الگ بنے ہوتے ہیں تو پھر جتنی لہریں یہ سمندر میں کودتی پھاندتی پھر رہی ہیں اُن کے لئے بھی اتنے ہی اصطبل چاہئیں اور پھر جیسے ہر گھوڑے کو کھانے کیلئے دانہ چاہئے، گھاس چاہیئے، پینے کو پانی چاہیئے۔ تو ان لہروں کو کھانا پینا کون دیتا ہے۔ پینے کو پانی تو سمندر میں بہت ہے مگر یہ لہریں کھاتی کیا ہیں؟ ابھی بچی اس اہم مسئلے پر غور کر ہی رہی تھی کہ مس میری اپنا نیلا فراک پہنے اپنی موٹی موٹی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں مارتی آگئیں۔ بچی نے اُن کے قدموں کی آہٹ سُن کر مڑ کر دیکھا کہ سمندر کی ہوا مس میری کے نیلے فراک کو اُڑا اُڑا کر اُن کے موٹے موٹے چربی چڑھے گھٹنوں سے اُوپر لے جا رہی ہے اور ان کے کھچڑی جیسے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔

"مس صاحب"۔ بچی نے اپنی انگریز گورنس سے کہا۔

"یس سلمہ"

"مس صاحب۔ سمندر میں اتنا بہت پانی کہاں سے آتا ہے؟"

"یہ سب واڑ ندی اور دریا میں سے آتا ہے مائی چائلڈ"۔ مس میری نے جواب دیا اور جغرافیہ کی کتاب میں سے سمندر اور دریاؤں والا باب زبانی دُہرایا۔

"تو پھر اگر ہم سمندر میں چلتے چلے جائیں، تو دریا آجائے گا؟"

"یس ــــ"

"وہی دریا جو ہمارے گھر کے پاس سے بہتا ہے"۔

"یس۔ وہ بھی آجائے گا"

"مس صاحب۔ ایک بات اور پوچھنی ہے"۔

"پوچھو، مائی چائلڈ۔"

"یہ اتنی ساری لہریں جو ہیں، سمندر میں یہ کھاتی کیا ہیں؟"

مس میری جنھوں نے اس سوال کا جواب کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا۔ سوچ میں پڑ گئیں لیکن ایک موٹا لال منھ کا مسافر جو دن بھر ڈیک چیئر پر لیٹا ہوا موٹا سگار پیتا رہتا تھا، ایک خوفناک قہقہہ مار کر بولا۔

"ویل ویل بے بی۔ ام تم کو بتاتا ہے۔ یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا ہے۔ ریلنگ سے ہٹ کر کھڑا رہو، نہیں تو لہر تم کو بھی کھا جائے گا"۔

اور یہ سُن کر بچی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی اور مس میری نے لال منہ والے کو ڈانٹ کر کہا۔

"مسٹر ولیم۔ دیٹ از ویری بیڈ۔ آپ ایک بے بی کو ڈرانا مانگتا۔ ویری بیڈ۔ کم آن ڈارلنگ۔"

اور وہ بچی کو کیبن میں لے گئی اور اس کو تصویروں والی کتاب دی کہ یہاں بیٹھ کر تصویریں دیکھو۔

"مس صاحب۔"

"یس مائی ڈیر ——"

"یہ جہاز گھر کب پہنچے گا؟"

"یہ جہاز گھر نہیں جاتے گا بے بی۔ یہ تو ساؤتھ ہیمٹن جاتے گا۔ وہاں سے ہم لوگ ریل سے لندن جائیں گے۔"

"لندن کیوں جائیں گے؟"

"اس لئے کہ تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں، تم اُدھر فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو۔ اُدھر سب انگریز بے بی لوگ ہو گا۔"

"مگر میں تو جھُنیا کے ساتھ پڑھنا چاہتی ہوں مس صاحب۔"

"جھنیا —— وہ سائیس کا چھوکری —— چھی چھی چھی —— دیٹ ڈرٹی لٹل گرل۔ تمہارا جیسا ہائی، کلاس بے بی ایک سائیس کا گندا چھوکری کے ساتھ کس مانگ پڑھ سکتا ہے۔ تمہارا ڈیڈی نہیں چاہتا کہ تم ایسا بچہ لوگ کے ساتھ کھیلے۔ اسی واسطے تم کو ہماری ساتھ انگلینڈ پڑھنے کو بھیجتا۔"

"تو پھر جھُنیا کو بھی لے چلو مس صاحب۔"

"ہم بولا بے بی کہ وہ ڈرٹی چھوکری ہے۔ ایک دم گندا۔"

"تو اُدھر لندن میں ہم اُسے نہلائیں گے مس صاحب۔ باتھ ٹب ہو گا نہ اُدھر ——"

"ایسا چھوکری کا ڈرٹ باتھ ٹب میں نہیں دھو سکتا۔"

"تو پھر میں لندن نہیں جاتی۔ میں تو گھر جاؤں گی۔ جھُنیا کے ساتھ کھیلوں گی۔"

"گھر اِدھر سے چار ہزار میل ہے بے بی۔"

"مگر کِدھر ہے؟"

"اُدھر، جہاز کے پیچھے، سمندر کے پار۔"

اور جب دوپہر کے کھانے کے بعد مس میری سو گئیں تو بچی دبے پاؤں کیبن سے نکلی اور ڈیک کے پچھلی طرف ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ہاتھ میں اُس کے ایک گڑیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں دو

کیلے۔ وہ جانتی تھی کہ جُھنیا کو کیلے بہت پسند ہیں۔

"اہا ہا ہا" اس نے سوچا۔ "سویہ ہے گھر جانے کی سڑک"

جہاز کے پیچھے جہاں پانی کٹ رہا تھا سفید جھاگوں کی ایک لمبی سڑک بنتی جا رہی تھی۔ جو دُور تک چلی گئی تھی۔ حدِ نظر تک۔ بچی کے گھر تک۔

بچی نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ لال منہ والا انگریز اپنی کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو رہا تھا اور اس کا سگار منہ میں لگا ہوا سُلگ رہا تھا اور اُس کی راکھ اس کے سفید سُوٹ پر گرتی جا رہی تھی اور کئی مسافر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

جہاز کے نیچے اس کے پیٹ میں سے انجنوں کی دھڑ دھڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ جہاز چلا جا رہا تھا۔ ساؤتھ ہیمپٹن کی طرف لندن کی طرف، اس اسکول کی طرف جہاں جُھنیا نہیں ہوگی۔

جُھنیا! ـــــ اپنی سہیلی کا خیال آتے ہی بچی مُسکرا دی۔

جُھنیا جو کالی تھی مگر جس کے چھوٹے چھوٹے دانت ایسے چمکتے تھے جیسے سچے موتی۔ جُھنیا جس کا شلوکہ اور لہنگا ہمیشہ گندا اور پھٹا ہوا ہوتا تھا، جس کی آنکھوں میں ہمیشہ چیپڑ لگے رہتے تھے اور جس کے چہرے اور ٹانگوں پر ہمیشہ گرد کی تہ جمی رہتی تھی مگر جو ہمیشہ ہنستی رہتی تھی، کھیلتی کودتی اور شور مچاتی رہتی تھی اور جب اُس کا باپ گھوڑوں کو نہلاتا یا اُن کی مالش کرتا تو وہ ضد کر کے گھوڑے پر بیٹھ جاتی تھی، اور کہتی تھی "چل میلے گھوڑے چل چل چل"

دو برس ہوئے بچی کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ جب ڈیڑھ مہینے کے بعد اس کا بخار ٹوٹا تو اتنی کمزور ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے ہدایت کی ابھی مہینے بھر تک چلے پھرے نہیں، پلنگ پر لیٹی رہے اور سو کتنے ہی دن تک وہ لیٹے لیٹے چھت میں لگے ہوئے بجلی کے پنکھے کے پروں کو گنتی رہتی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ بیس، اٹھائیس، بیالیس ..... تین سو دس ..... آٹھ سو بارہ ـــ اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ پنکھے کے پروں کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نہ جانے کہاں سے ایک کے بعد ایک پنکھے کے پر ہوا میں سے نکلتے ہی آتے تھے۔ مگر پھر وہ اس کھیل سے اُکتا گئی اور دیواروں پر دوڑتی ہوئی چھپکلیوں کی دوڑ بھاگ میں دلچسپی لینے لگی۔ یہ چھپکلیاں بالکل سرکس کے مداریوں کی طرح تھیں۔ دیوار پر سیدھی اُوپر چڑھ جاتی تھیں مگر تھیں بہت گندی۔ کیڑے مکوڑے، مکھی، مچھر کھاتی رہتی تھیں۔ جس کو دیکھ کر بچی کا جی متلانے لگتا اور سو آخر کار اس نے سوچا کہ میں اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر باغ ہی کی سیر کر لوں"

باغ میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور تتلیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں اور دُور لان پر اُن کا بوڑھا مالی گلاب کی کیاریوں میں فوارے سے پانی دے رہا تھا اور نیم کے پیڑ پر لال لال چونچ والے طوطے بیٹھے تھے اور دور آم کے پیڑوں میں ایک کوئل کُو کُو کر رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ان

سب چیزوں سے بچی کا جی اُکتا گیا۔ کیونکہ وہ چاہتی تھی کسی سے بات کرنا اور بات کرنے کی اُسے ڈاکٹر بینرجی کی طرف سے سخت ممانعت تھی۔ اسی لئے تو اس کے ڈیڈی نے مس میری کو ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی کو بچی کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ دی جائے اور چونکہ بچی خود بہت باتونی تھی اور مس میری سے ہر وقت اوٹ پٹانگ سوال کرتی رہتی تھی اور ڈیڈی سے سوال کرتی تھی کہ مجھے کوئی پریوں کی کہانی سنایئے۔ اس لئے ڈاکٹر اور ڈیڈی دونوں کے حکم سے اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند رکھا جاتا تھا اور صرف دوا اور کھانے کے اوقات پر مس میری چند منٹ کے لئے اندر جاتی تھیں۔

اور سوجب اس نے باغ میں اپنی ہم عمر ایک بچی کو دوڑتے بھاگتے دیکھا تو سلمہ بے اختیار چلا پڑی۔

"اے۔ اے۔ اِدھر آ۔"

"سلام چھوٹی بی بی۔"

"تم مجھے جانتی ہو؟"

"جرور جانتی ہوں۔ یہ فراک جو میں پہنے ہوں یہ تمہارا ہی تو ہے چھوٹی بی بی۔"

اور سلمہ نے پہچان لیا کہ میل اور پیوندوں کے نیچے جو نیلی دھاریوں کا فراک ہے وہ واقعی کبھی اس کا ہی تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جھُنیا۔"

"اور میرا نام ہے سلمہ۔"

"نہیں۔ تمہارا نام ہے چھوٹی بی بی۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"بابا نے۔"

"تمہارے بابا کیا کرتے ہیں؟"

"آپ کے گھوڑوں کو دانہ کھلاتے ہیں، اُن کو نہلاتے ہیں، اُن کی مالش کرتے ہیں۔"

"تم تو سائیس رام دین کی بیٹی ہو؟"

"ہاں ——"

"تم اسکول پڑھنے نہیں جاتیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بابا کہتے ہیں سائیسوں کے بچے سکول نہیں جاتے۔"

"پھر تم دن بھر کیا کرتی ہو؟"
"کھیلتی ہوں اور بابا کہیں تو گھوڑوں کو پانی پلا دیتی ہوں۔"
"اور جب تمھیں بخار آتا ہے تب کیا کرتی ہو؟"
"جب بخار آتا ہے تو میں کھوب دھوپ میں بھاگتی ہوں۔ پسینہ آکے بخار آپ سے آپ بھاگ جاتا ہے۔ پر چھوٹی بی بی تم کیوں کمرے میں بند رہتی ہو؟"
"ڈاکٹر اور ڈیڈی کا حکم نہیں ہے باہر نکلنے کا۔"
"ڈاکٹر بہت برا آدمی ہے چھوٹی بی بی۔"
"کیوں؟"
"وہ سوئی لگاتا ہے۔ ایک بار میرے سوئی لگائی تھی تو تین دن تک بانہہ سوجی رہی تھی۔"
اور سو اُن کی دوستی ہو گئی۔ میلے پیوند لگے فراک پہننے والی سائیس کی بیٹی جھنیا اور نائیلون کا نائٹ گاؤن پہننے والی سر عظیم اللہ کی بیٹی سلمہ سہیلیاں بن گئیں۔
روز جھنیا سلمہ کے لئے باغ میں سے چرا کر پھول، کچی کیریاں اور کچے پکے امرود لاتی اور اُن کے بدلے میں سلمہ اُسے اپنے بالوں میں لگانے کے لئے ریشمی ربن اور رنگین تصویروں والی کتابیں، اور بولنے والی گڑیاں دیتی اور گھنٹوں سلمہ کھڑکی میں بیٹھی جھنیا سے باتیں کرتی رہتی۔ سلمہ اکثر سوچتی جھنیا کتنی خوش قسمت ہے۔ دن بھر کھیلتی گھومتی پھرتی ہے۔ کوئی اسے نہیں روکتا۔ دس دس دن نہاتی نہیں، کوئی اُسے زبردستی ٹب میں بٹھا کر صابن مل مل کر زبردستی نہیں نہلاتا۔ جو اس کا جی چاہتا ہے کھاتی ہے، جب جی چاہتا ہے درختوں پر چڑھ جاتی ہے۔ اُسے دُنیا کے بارے میں بھی تو کتنا کچھ معلوم ہے۔ وہ جانتی ہے کہ گھوڑی کی نال کیسے لگائے جاتے ہیں اور پن چکی پر آٹا کیسے پیسا جاتا ہے اور نوٹنکی میں لال پری کیسے ناچتی ہے اور کالا دیو کیسے دہاڑتا ہوا آتا ہے اور اُسے اُٹھا کرلے جاتا ہے اور مالی کا بیٹا کلوا جس کا پچھلے برس ہی بیاہ ہوا تھا، کیسے ٹھرا پی کر پہلے اپنی بہو کو مارتا ہے اور پھر پیار کرتا ہے اور اور —— جھنیا جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی، یہ سب باتیں سلمہ کو سناتی رہتی اور سلمہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک سنسان ٹاپو میں قید ہے، زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف زندگی کا سمندر پھیلا ہوا ہے اور اس سمندر میں جھنیا مزے سے چھینٹے اُڑا رہی ہے، تیر رہی ہے —— ڈبکیاں لگا رہی ہے۔
ایک دن جھنیا دیر کر کے آئی تو سلمہ نے پوچھا "اری تو کہاں رہی؟ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔"
"چھوٹی بی بی۔ میں ذرا اصطبل میں گئی تھی۔ آپ کی گھوڑی ہے نا چنبیلی، اُس کے بچہ ہونیوالا ہے

"بچہ کیسے ہوتا ہے؟"

"یہی تو میں دیکھنے گئی تھی چھوٹی بی بی۔"

"پھر دیکھا نہیں؟"

"نہیں۔ بابا کہویں ہیں کہ ابھی تھوڑی دیر ہے ۔۔ پر چنبیلی بڑے جور جور سے سانس لے رہی ہے۔ میں تو سمجھی تھی، مر رہی ہے۔ وہ ہماری چت کبری گُتیا تھی نا، وہ جب مری تھی تو وہ بھی ایسے ہی سانس لے رہی تھی۔"

"تو کیا چنبیلی بھی مر جاوے گی؟"

"نہیں چھوٹی بی بی۔ پھکر نہ کرو۔ بابا کہویں ہیں کہ مَر مَر کے ہی جندگی پیدا ہووے ہے۔ اچھا، اب میں چلوں، پھر آؤں گی۔"

"اے جھُنیا ۔۔ !"

"ہاں چھوٹی بی بی ۔۔"

"میں بھی چلوں تیرے ساتھ؟ دیکھوں گھوڑی کا بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟"

"اور جو کسی نے دیکھ لیا تو بڑے صاحب مجھے ہنٹر لگائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ آبا تو کورٹ گئے ہوئے ہیں اور مس میری اپنے کمرے میں پڑی سو رہی ہیں۔" سو وہ کھڑکی سے کُود گئی، اور اس کا نائیلون کا نائٹ گاؤن کانٹوں میں اُلجھ کر کئی جگہ سے پھٹ گیا اور اس کا ٹخنہ چِھل گیا۔ مگر اس کا دل ایک نامعلوم مسرت اور ایک عجیب خوف سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے وہ دونوں باغ کی کیاریوں میں سے نہیں بلکہ گھنے اندھیرے جنگل میں سے ہو کر پریوں کے دیس کی طرف جا رہے ہوں۔ بالکل جیسے مس میری کی کہانیوں کی شہزادیاں جاتی تھیں اور پھر وہ دونوں اصطبل کے بالکل سامنے تھیں اور اندر سے چنبیلی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ بلکہ ایک بار تو وہ اتنے درد بھرے انداز میں ہنہنائی کہ سلمہ ڈری کہ شاید اس کی پیاری گھوڑی سچ مُچ مر رہی ہے مگر فوراً ہی اُسے جھُنیا کے بابا کا کہنا یاد آیا، کہ مَر مَر کے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اصطبل کا دروازہ کھُلتے ہی زندگی کا سب سے بڑا اور خوفناک راز اس پر آشکار ہو جائے گا اور اس کا دِل اور بھی زوروں سے دھڑکنے لگا۔

لیکن اصطبل کا دروازہ نہیں کھُلا۔ اس وقت نہیں کھُلا۔ زندگی بھر نہیں کھُلا۔ پیچھے سے اس کو بیوک کار کا ہارن سُنائی دیا اور جب سلمہ اور جھُنیا نے گھبرا کے مڑ کر دیکھا تو سَر عظیم اللہ موٹر سے اُتر کر اُن کی طرف آ رہے تھے۔ بدن پر کچہری والا کالا کوٹ اور دھاریوں والی پتلون۔ سر پر سفید ہیٹ، اور سلمہ نے دیکھا کہ اس کے ڈیڈی کی مونچھیں جو ولایتی گوند سے نکیلی بنائی جاتی تھیں اور ہمیشہ نہ صرف

چڑھی بلکہ اکڑی رہتی تھیں۔ اس وقت غصّے سے ہِل رہی ہیں جیسے شکار کو دیکھ کر اُن کے شکاری کُتّے شیرو کی دُم ہلنے لگتی ہے۔

سلمہ کو پھر اس کے کمرے میں قید کر دیا گیا۔ جُھنیا کے بابا کو کہہ دیا گیا کہ اُس کی چھوکری نے پھر کبھی چھوٹی بی بی سے بات کی تو اُس کی ہنڑ سے خبر لی جائے گی۔

اگلے ہفتہ ہی سلمہ کو مسوری پڑھنے کے لئے بھیج دیا گیا اور ایک برس بعد مس میری کی تجویز پر اُن کے ساتھ اسے انگلستان بھیج دیا گیا اور جب اُن کی بیوک کار احاطے سے باہر سڑک پر آئی تو سلمہ نے دیکھا کہ جُھنیا پیچھے دوڑتی ہوئی آ رہی ہے۔ سلمہ چلائی "ڈیدی۔ ڈیڈی۔ میں جھنیا سے مِل لوں۔" مگر سرعظیم اللہ نے ڈرائیور کو کار نہ روکنے دی اور جُھنیا موٹر کے پہیّوں سے اڑی ہوئی دھول کے بادلوں میں کھو گئی اور اس کے بعد صرف سڑک ہی سڑک رہ گئی۔ جو ہر لمحے کھلنے والے جیبی فیتے کی طرح لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی۔

اور اب یہ سڑک جہاز کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور ہر لمحہ سلمہ اور جُھنیا کے درمیان کا فاصلہ لمبا کرتا جا رہا تھا۔

مگر بچّی نے سوچا یہ سڑک یہاں سے ہمارے گھر تک جاتی ہے۔ اگر میں یہاں سے اس سڑک پر چلنا شروع کروں، اور چلتی رہوں، چلتی رہوں، اس وقت سے لے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک چلتی ہی رہوں، راستے میں ایک بار بھی نہ رکوں، تو ابھی اصطبل کے پچھواڑے مُرغی خانے میں مرغے اذان دے رہے ہوں گے کہ میں گھر پہنچ جاؤں گی اور پیچھے سے جا کے سوتی ہوئی جُھنیا کی آنکھیں بند کر لوں گی اور کہوں گی "جھنیاری جُھنیا۔ بول تو سہی میں کون ہوں۔" اور جب وہ میری آواز پہچان کر میرے پیچھے بھاگے گی تو میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوں گی اور سارے باغ میں اُسے دوڑاؤں گی اور اس کے ہاتھ نہ آؤں گی۔ مگر اس وقت تو ڈیڈی وہاں اپنا بھورے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے ٹہل رہے ہوں گے۔ تو پھر کیا ہوا۔ میں اُن سے کہہ دوں گی "ڈیڈی۔ میں لندن وندن نہیں جاؤں گی۔ میں تو یہاں رہوں گی اور جھنیا کے ساتھ کھیلوں گی اور اُس کے ساتھ اصطبل میں جا کر دیکھوں گی کہ ہماری چنبیلی کے بچہ کیسے ہوتا ہے۔"

جہاز کے پیچھے پانی پر سفید جھاگوں کی سڑک سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ سلمہ کو ایسا لگا جیسے سڑک مسکرا کر اُسے بلا رہی ہے۔ جیسے سڑک کہہ رہی ہے "چل سلمہ۔ میں تجھے جُھنیا سے ملا دوں۔"

اور سونچی نے اس سڑک کی طرف قدم بڑھا ہی دیا۔

مگر وہ سڑک نہیں تھی۔

وہ ایک کنواں تھا، اندھیرا اور ٹھنڈا۔ اور دم گھوٹنے والا اندھا کنواں۔

وہ نیچے جا رہی تھی اور اس کے کان میں ایک لال منہ والے انگریز کی آواز گونج رہی تھی۔

"یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا ہے۔"

اور اب وہ خوفناک لہریں جو ہاتھی کی طرح موٹی تھیں اور اُونٹ کی طرح اونچی تھیں اور شیر کی طرح دہاڑتی تھیں اور کہانیوں والے اژدہوں کی طرح پھنکارتی تھیں۔ بچی کے چاروں طرف شیطانوں کی طرح ناچ رہی تھیں۔ چلا چلا کر کہہ رہی تھیں ــــ

"ہم تمہیں کھا جائیں گے، ہم تمہیں کھا جائیں گے۔"

اور نہ جانے کہاں سے اُن کے اصطبل کا دروازہ بہتا ہوا وہاں آگیا اور جب بچی نے وہ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ چنبیلی گھاس پر لیٹی ہوئی زور سے سانس لے رہی ہے اور اس کا پیٹ کسی نے کاٹ ڈالا ہے اور پیٹ میں سے اور بھی بھیانک سمندری لہریں باہر نکل رہی ہیں اور پھر ایک سمندر، اور دوسرا سمندر اور تیسرا سمندر سب ایک ہو گئے اور سب مل کر بچی کا گلا گھونٹنے لگے اور اس کے دماغ پر اندھیرا چھانے لگا۔ مگر اس اندھیرے میں گم ہوتے ہوتے اس نے محسوس کیا کہ دو مضبوط ہاتھوں نے اُسے پکڑ لیا ہے اور اب وہ کنوئیں میں نیچے کی طرف نہیں جا رہی، کسی زینے پر چڑھتی ہوئی اُوپر کی طرف جا رہی ہے۔

جب کئی گھنٹے بعد بچی کو ہوش آیا اور لہروں کے جہاز سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی، تو اس نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور دہشت زدہ آواز میں چلائی:

"مس صاحب! مجھے سمندر سے بچاؤ۔"

●

"ارے بھئی یہ مس صاحب کون ہیں، جنہیں آواز دے رہی ہو؟"

سلمہ نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ دھوپ کمرے میں پھیل چکی ہے اور انور اپنی پیار بھری نگاہوں سے اُسے چوم رہا ہے۔

"پیاری بچی! خواب میں پھر ڈر گئیں!"

"نہیں" اس نے شوہر کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا: "تم میرے پاس رہو گے تو میں کسی چیز سے نہیں ڈروں گی۔"

"سمندر سے بھی نہیں؟"

"نہیں!"

مگر نہ جانے کیوں انور کو محسوس ہوا کہ اس "نہیں" میں یقین اور قطعیت کی کسی قدر کمی ہے۔

# علاج

سمندر میں لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ لہروں میں کشتی ڈول رہی تھی اور کشتی پر ایک سرے پر انور بیٹھا تھا اور دُوسرے پر سلمہ۔

(سلمہ سوچ رہی تھی ـــــ کہتے ہیں ایسے بھی سچے عاشق ہوتے ہیں جو محبت کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ چلو جی انور میاں، آج تمھاری خاطر ہم بھی جان دیتے دیتے ہیں۔)

(اور انور سوچ رہا تھا ـــــ بڈھا ڈاکٹر باسو ہے تو بڑا عقلمند آدمی اور نفسیات کا مانا ہوا اُستاد۔ مگر بڑے میاں نے کہیں مجھے اُلٹا سبق تو نہیں پڑھا دیا۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔)

سمندر میں لہریں اُٹھ رہی تھیں اور ہر اُٹھتی لہر کے ساتھ سلمہ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتی تھی تو اس کا تخیل اُسے سمندر کی اندھیری گہرائی میں لے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا اور جب ڈر کے مارے وہ آنکھیں کھول دیتی تو دیکھتی کہ ایک لہر کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری لہر منہ پھاڑے اس کو نگلنے کے لئے چلی آ رہی ہے۔

(ہائے اللہ۔ اس نے سوچا۔ میں نے کمزوری کے کس لمحے میں اس کشتی میں بیٹھنا منظور کر لیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں پہلے ہی کہہ دیتی کہ جاؤ بھائی تم ٹاپو پر جا کر مچھیرن کا بچہ جنواؤ۔ اُس کا آپریشن کرو، جو چاہے کرو۔ تم کہو گے تو جہنم میں چلی جاؤں گی مگر اس کشتی میں نہیں بیٹھوں گی۔ سمندر کمبخت میں بھی تو طوفان آ رہا ہے۔ ہائے اللہ، تو کیا میں اللہ کو مانتی ہوں؟ کون جانتا ہے، شاید مانتی ہی ہوں۔ کیمبرج میں پڑھا ہوا فلسفہ تو کہتا ہے، اللہ صرف ایک واہمہ ہے، مگر یہاں سمندر کی ان خونخوار لہروں میں تو مجھے ہر طرف خدا کا قہر ہی قہر نظر آ رہا ہے۔ نہ جانے کون کون سے گناہ میرے نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے ہیں، جن کی سزا میں مجھے اس سمندری قبر میں آج دفن کیا جاتے گا مگر کیا منکر نکیر سمندر کی تہہ میں پڑے ہوئے مُردوں سے بھی سوال و جواب کرتے ہیں؟)

(اور انور سوچ رہا تھا، کمال ہے کہ سلمہ سوئٹزرلینڈ کی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی خطرناک ڈھلوانوں پر سکیٹنگ کر آتی ہے۔ درجنوں بار ہوائی جہاز میں سفر کر چکی ہے۔ خود ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے لیکن ایک کشتی میں دو میل کے سمندری سفر سے اُس کی رنگت پیلی پڑ گئی ہے۔ سمندر کی یہ ہیبت تو اُس کے شعور میں چھپی بیٹھی ہے نہ جانے کتنے برسوں سے۔ کیا اس ہیبت کو کوئی بھی وہاں سے نکال سکتا ہے؟ شاید محبت نکال سکتی ہے۔ آج بے چاری میری خاطر اس کشتی میں بیٹھ ہی گئی نا۔ بڑا ظلم کیا ہے میں نے اُس کے ساتھ۔

اُس دن سویرے جب وہ سو کر اُٹھے تھے تو انور کو یقین نہیں تھا کہ سلمہ اس کے ساتھ آنے

کو تیار ہو جائے گی۔

ناشتے کی میز پر سلمہ نے حسبِ معمول پہلا سوال یہی کیا تھا "ڈارلنگ! وہ فلیٹ ہمیں کب تک مل جائے گا؟"

اور حسبِ معمول انور نے جواب دیا تھا " بہت جلد۔ شاید اگلے مہینے ہی ہم شفٹ کر جائیں۔ شاید۔۔

"یہ شاید کیوں؟"

اس لئے کہ شاید اس عرصے میں تمہارے دل سے سمندر کی ہیبت نکل جائے اور تم سمندر سے ڈرنا چھوڑ دو۔"

"کون کہتا ہے میں سمندر سے ڈرتی ہوں؟"

" تو پھر یہ گھر کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟"

" بس مجھے سمندر پسند نہیں ہے "۔

یہ انور کے لئے ایک اور حیرت کی بات تھی۔ رات کو وہ سمندر سے ڈرتی تھی لیکن دن کے اُجالے میں وہ اس خوف کا اقرار کرنے کو تیار نہیں تھی۔

" بس مجھے سمندر پسند نہیں "۔

وہ کہے جا رہی تھی۔

" مجھے سمندر میں کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تمہارا سمندر بور کرتا ہے ـــــ"

اس کی آواز اُونچی ہوتی گئی تھی۔ اس میں ہسٹریا کی کیفیت آتی گئی تھی اور انور نے دیکھا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں ایک ایسے خوف کی چمک ہے جیسے دن دہاڑے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو ـــــ

" دھیرے دھیرے چھری چلاتے ہوئے انور نے کہا۔

"سلمہ تم نے وہ پکچر دیکھی تھی؟"

"کون سی پکچر؟"

"کیا نام تھا اُس کا؟ ہاں۔ اب یاد آیا۔ لیون ہرٹو ہیون"۔

" ہاں دیکھی تھی۔ مگر اس وقت اس کی یاد کیسے آئی؟"

" اس میں بھی تو سمندر کا ایک سین ہے۔ ایک شکی مزاج بیوی ہے جو دوسری لڑکی کو کشتی میں بٹھا کر سمندر میں لے جاتی ہے"۔

" ہاں۔ شاید کوئی سین تھا تو ایسا۔ اچھی طرح یاد نہیں"۔

اور بیچ سمندر میں جا کر بیوی اطمینان سے کہتی ہے کہ کشتی کے تختوں میں اُس نے ایک سُوراخ کر رکھا ہے، جس میں سے پانی بھرتا جا رہا ہے اور اب تھوڑی دیر میں دونوں ڈوب جائیں گی"۔

"کیا بھیانک کہانی یاد آئی ہے تمہیں؟ بھلا یہ بھی کوئی موقعہ ہے ایسی کہانی سنانے کا؟"

"اس سے بہتر کونسا موقعہ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں کشتی میں ہیں۔ کشتی سمندر میں ہے اور کون جانتا ہے تھوڑی دیر میں سمندر ہماری کشتی میں ہو۔"

"بھئی مجھے ڈراؤ مت۔ خدا کے لئے کوئی اور بات کرو۔ تمہارا سمندر مجھے بور کرتا ہے۔"

"تو سمندر تمہیں بور کرتا ہے؟ انور نے چپوؤں کو پورے زور سے چلاتے ہوئے دانت پیس کر پوچھا اور اپنی آواز میں سے اس نے محبت کے شائبے کو بھی نکال پھینکا۔

"ہاں ہاں۔ بور کرتا ہے۔" سلمہ چلائی اور اسی وقت ایک لہر کا طمانچہ اس زور سے پڑا کہ وہ سر سے پیر تک شرابور ہو گئی۔

"جیسے میں بور کرتا ہوں؟"

اور انور کی آواز کا طمانچہ سمندر کی لہر سے بھی بہت زیادہ خوفناک تھا۔

"انور ڈارلنگ! تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ تم کیسے سوچ سکتے ہو۔ میں..... میں..... تم سے..... محبت....."

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی۔ نہ مجھ سے، نہ جُھنیا سے۔"

"جُھنیا—!

دفعتاً سلمہ کے لاشعور کی تہ میں ہزاروں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ماضی کے پُراسرار دروازے آپ سے آپ کھلنے لگے۔

وہ چلائی۔

"جُھنیا کے بارے میں تم کیسے جانتے ہو؟"

"ایسے کہ تم ہمیشہ خواب میں چلاتی رہتی ہو۔ جُھنیا مجھے معاف کر دو۔ جُھنیا میں مجبور تھی۔ جُھنیا میں تم تک نہیں آ سکتی۔ بیچ میں سمندر ہے اور مجھے سمندر سے ڈر لگتا ہے۔ تقریباً ہر رات کو تم سوتے سوتے یہ بڑبڑاتی ہو لیکن سلمہ جو ڈرتے ہیں، وہ محبت نہیں کر سکتے۔ نہ اپنی بچپن کی سہیلی سے نہ اپنے شوہر سے۔"

"انور تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو— ؟ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟"

"جانتی ہو میں کون ہوں؟"

"تم میرے شوہر ہو۔ تم ایک مشہور ڈاکٹر ہو۔۔۔۔"

"مگر جانتی ہو، میرا باپ کون تھا؟ میں کہاں پیدا ہوا تھا؟ کس خاندان میں؟

"میں نہیں جانتی اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں جانتی ہوں انور۔۔۔ اور میں کچھ جاننا

نہیں چاہتی۔ مجھے ماضی کے دروازے کھولنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اس لئے کہ تم ماضی سے ڈرتی ہو..... جیسے تم سمندر سے ڈرتی ہو، جیسے تم زندگی سے ڈرتی ہو، جیسے تم محنت اور مفلسی سے ڈرتی ہو، جیسے تم سچائی سے ڈرتی ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

"تو سنو۔ میرا باپ تمہارے باپ سرعظیم اللہ کے دوست راجہ جیپال سنگھ تعلقدار کے فیل خانے میں مہاوت تھا۔ میں اسی فیل خانے میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے سائیسوں اور بھنگیوں کے بچوں کے ساتھ پرورش پائی ہے اور یہ ڈاکٹری، یہ تعلیم، یہ نام، یہ عزت مجھے بخششیں ملی ہے اپنے باپ کی جان کے عوض۔ اس لئے کہ وہ راجہ صاحب کا نمک حلال ملازم تھا اور اس نے مالک کی اولاد کی جان بچانے کے لئے اپنی جان دے دی۔"

"یہ سب مجھے کیوں سُنا رہے ہو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ تم سے شادی کی ہے، تمہارے خاندان سے نہیں۔"

"اسی لئے سنا رہا ہوں کہ جو سچائی سے ڈرتا ہے، وہ مجھ سے کیا کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتا ——— اور اسی لئے آج میں تمہیں یہاں....."

سلمہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ کیونکہ اسی دم اس نے دیکھا کہ کشتی آدھی سے زیادہ پانی سے بھر چکی ہے۔

"انور ———!"

وہ چلائی

یہ کیا ہے ——— کیا تم مجھے یوں مارنے کے لئے یہاں لائے تھے؟"

انور نے اطمینان سے چپو سمندر میں پھینک دیئے۔

"تمہیں تیرنا تو آتا ہوگا ڈارلنگ!"

"آتا ہے ——— مگر تالاب میں ——— سمندر میں نہیں۔"

"اسے بھی ایک لمبا چوڑا تالاب ہی سمجھو ——— صرف گہرائی ذرا زیادہ ہے۔ دو چار ہاتھی ڈباؤ پانی ہوگا۔ وہ سامنے والی چٹانیں زیادہ دور نہیں ہیں۔"

اور اب سلمہ کی ہیبت زدہ نگاہوں نے دیکھا کہ کشتی تین چوتھائی پانی سے بھر چکی ہے اور کسی دم میں ڈوبنے ہی والی ہے۔

"ٹاٹا ڈارلنگ!"

اور یہ کہہ کر انور نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور ٹاپو کے کنارے کی چٹانوں کی طرف تیر کر جانے

لگا اور پھر ایک اونچی سی لہر آئی اور وہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔

بچی لہروں کو گن رہی تھی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ کوئی اونچی، کوئی نیچی، کوئی موٹی کوئی پتلی۔ کوئی رینگتی ہوئی آ رہی تھی۔ کوئی دوڑتی ہوئی، کوئی چنگھاڑتی ہوئی اور کوئی دہاڑتی ہوئی اور پھر ان سب لہروں کی ایک نانی اماں آئی اور اس کے ساتھ سمندر سچ مچ کشتی میں آ گیا اور بیس برس کے بعد بچی آج پھر بھوکی لہروں کے بھیانک جبڑوں میں جا پڑی۔

دور کہیں سے ایک آواز گونجی۔

"یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا۔"

"چھوٹا بے بی!

نمکین پانی چکھتے ہوئے بچی اندھیرے کنوئیں کی تہہ کی طرف جا رہی تھی، کہ اس کے شعور میں کوئی چیز یکایک بیدار ہو گئی۔ جیسے سویا ہوا شیر جاگ اٹھتا ہے، غراتا ہوا۔

تو یہ لہریں چھوٹے چھوٹے بے بی کھاتی ہیں مگر میں چھوٹا بے بی نہیں ہوں۔ بندر کی طرح لال منہ والے صاحب، کان کھول کر سن لو۔ میں چھوٹا بے بی نہیں ہوں۔"

اور اسی وقت اس کے دونوں ہاتھوں نے اس لال منہ والے صاحب کو اس زور سے دھکا دیا کہ نیچے جانے کی بجائے وہ اوپر کی طرف اٹھنے لگی۔

پھر اس کے شعور میں قریب ہی سے ایک جانی پہچانی پیار بھری آواز نے چڑایا۔

"تم سچ مچ بچی ہو، بچی ہو۔ بچی ہو؟"

"میں بچی نہیں ہوں"

سمندر کی تہہ سے اوپر اٹھتے ہوئے اس کا دل دھڑکتا ہوا چلایا۔

"میں بچی نہیں ہوں۔ میری عمر تیس برس ہے۔ میں نے کیمبرج سے فلسفے میں ڈگری لی ہے۔ میں نے ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ میں نے ماضی اور مستقبل، ہر دروازے اور تہذیب و تمدن کے ہر دریچے میں جھانک کر دیکھا ہے۔"

مگر ایک آواز جو انور کی سی آواز تھی، اسے چڑائے جا رہی تھی۔۔۔

●

مگر تم نے اپنے اصطبل کے دروازے میں سے جھانک کر نہیں دیکھا کہ گھوڑی کے بچہ کیسے ہوتا ہے؟"

"وہ سب بھی مجھے معلوم ہے۔ جانتے ہو میرا شوہر کتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھے زندگی کے

سب بھید بتا دیتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اس ٹاپو پر ایک مچھیرن کا بچہ جنوانے جا رہا ہے۔ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے، پھر بھی وہ جا رہا ہے کیونکہ اس وقت ہسپتال میں کوئی دوسرا ڈاکٹر موجود نہیں ہے ——
میرا شوہر بہت بڑا آدمی ——"

نہیں۔ نہیں۔ میرا شوہر بہت بُرا آدمی ہے۔ وہ تو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ہاں اور کیا۔ مگر میں اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں۔"

اور یہ سوچ کر اس نے اتنے زور سے ہاتھ پاؤں مارے کہ سمندر کی سطح سے باہر نکل آئی ——— سامنے ہی ٹاپو کی چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔

سامنے سے ایک لہر آئی اور اتنے زور سے اس سے ٹکرائی کہ ایک لمحہ کے لئے سلمہ چکرا گئی۔

مگر اگلے لمحے ہی وہ سوچ رہی تھی۔

"وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ مہابت کا بیٹا ہے تو ہوا کرے۔ میرے باپ سر عظیم اللہ بھی تو کبھی معمولی وکیل تھے اور ان کے باپ سلیم اللہ اودھ کے لیفٹننٹ گورنر کے منشی تھے اور اُن کے باپ نعیم اللہ واجد علی شاہ کا حُقّہ بھرا کرتے تھے، تو اس میں شیخی کی بات کون سی ہے؟"

اور اس بار جو ایک لہر جھاگ اگلتے اس کی طرف بڑھی تو اس نے عین وقت پر ڈبکی لگا دی اور لہر اُس کے اُوپر سے گزر گئی۔

"ہونہہ!" اس نے سوچا "یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی لوگ کو کھانا مانگتا ہے۔ ابے انگریز کے بچے۔ جا اپنے بابا لوگ کو ڈرا۔ چلا ہے مجھے ڈرانے!"

اور اگلی لہر جو مس میری کی طرح موٹی تازی تھی، جھومتی جھامتی اُس کی طرف آئی تو ایسے ایسا لگا، جیسے کوئی اس سے کہہ رہا ہو۔

"اِدھر کہاں جا رہی ہو، بے بی۔ تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں تم اُدھر لندن میں فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو۔"

مگر سلمہ اس لہر کے جبڑوں میں سے یہ سوچتی ہوئی صاف نکل گئی ——

"ٹاٹا مس صاحب۔ مگر میں تو اب گھر جاؤں گی، اور جھینگا کے ساتھ کھیلوں گی۔"

اور پھر ایک اور لہر آئی۔ اس کیمبرج والے سائیکاٹرسٹ جارج رُسل کی طرح دھیمی چال چلتی ہوئی۔

"سلمہ ڈارلنگ! یو آر ریپرسڈ۔ ویٹ از دیٹ یو آر!" تم قدرت کی گنہ گار ہو کیونکہ تم جنسی، اخلاط سے ڈرتی ہو۔"

اس لہر کے اُوپر سے تو وہ ایسی آسانی سے گزر گئی جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

"جاؤ جاؤ جیورجی بوائے۔ پہلے اپنے دانتوں کے پائیریا کا علاج کروا کے آؤ۔ پھر ذرا اندر سے

میرے سائیکوانالی سس کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنا۔"

اور پھر لہروں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور وہ ٹاپو کے ساحل پر پایاب پانی میں کھڑی ہوئی اپنے بھیگے ہوئے، تھکے ہوئے، چوٹ کھاتے ہوئے بدن میں ایک نئی طاقت ایک نئی تازگی محسوس کر رہی تھی۔ سامنے سرسبز ٹاپو تھا۔ ناریل کے کمان کی طرح بل کھاتے ہوئے پیڑ تھے۔ ساحل پر مچھیروں کے جال سوکھ رہے تھے اور دور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

"دنیا کتنی خوبصورت ہے"۔ اس نے سوچا۔ "آج سے پہلے تو مجھے کبھی اتنی خوبصورت نہ لگی تھی۔"

پھر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سمندر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پر لہریں دوڑ بھاگ کر رہی تھیں جیسے باپ کے سینے پر بچے کھیلتے ہیں۔ کیا یہی وہ سمندر ہے جس سے وہ کبھی ڈرتی تھی! مگر اسے اس کی کوئی وجہ یاد نہ آئی۔

زمین خوبصورت تھی۔ آسمان اور آسمان پر بکھرے ہوئے بادل خوبصورت تھے، نیلا سمندر خوبصورت تھا۔ حسن کے اس پھیلاؤ میں بس ایک ہی کمی تھی۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

"انور ــــ!"

ہائے اس ظالم نے مجھے ڈبونے کی کوشش میں کہیں خود تو جان نہیں دیدی؟

اور اسی دم سامنے سے آتی ہوئی ایک لہر ٹوٹی اور اس میں سے ایک گھنے سیاہ بالوں والا سر نکلا اور دو چوڑے چکلے شانے نکلے اور ایک لمبا تڑنگا جسم نکلا۔

"ہائے اللہ! یہ سمندر کتنا اچھا ہے کہ اس میں سے آج میرے انور نے جنم لیا ہے!"

"انور ڈارلنگ!"

اور وہ بھاگ کر اس سے چمٹ گئی۔

"تو تم میرے پیچھے پیچھے آرہے تھے؟ اور میں سمجھی تم مجھے ڈوبنے کے لئے چھوڑ کر چل دیئے۔"

"ارے، تم تو رو رہی ہو۔؟"

"خوشی کے مارے۔"

"تم سچ مچ بچی ہو۔"

"اب تم مجھے جو چاہے کہو۔ میں بچی کہلانے سے نہیں چڑتی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب میں بچی نہیں رہی۔ آج میں جوان ہوگئی ہوں۔ اچھا ہی ہوا وہ کشتی ڈوب گئی۔"

"اُسے تو ڈوبنا ہی تھا۔ پورے ڈیڑھ سو روپے دیئے ہیں۔"

"تو تم نے جان بوجھ کر یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا؟"

"سمندر سے تمہاری دوستی جو کرانی تھی؟"
"اور جو میں سچ مچ ڈوب جاتی؟"
"جس پانی میں تم ڈوبنے والی تھیں وہ صرف چار فٹ گہرا ہے اور تمہارا قد ساڑھے پانچ فٹ ہے۔"

●

تم بڑے فراڈ ہو۔"
"بڑا فراڈ تو فرائیڈ ہے۔"
"اور یہ مچھیرن کی زچگی کا بہانہ؟ یہ سب بھی فرضی تھا؟ تمہارا تو ڈاکٹری بیگ بھی ڈوب گیا۔"
"وہ تو خالی تھا ــــ اصل بیگ لے کر میرا اسسٹنٹ پہلے ہی یہاں آچکا ہے۔"

●

مچھیرن کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے وہ مر رہی ہو۔
سلمہ باہر کھڑی دروازے کی ریخ میں سے جھانک رہی تھی اور خوف سے اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔
"سلمہ اندر آجاؤ۔"
اور پھر انور نے مرہٹی میں مچھیرن سے کچھ کہا۔
بیس برس سے جس دروازے کے باہر وہ بچی کھڑی تھی، اُسے کھول کر آج وہ اس کے اندر چلی گئی۔

●

مچھیرن پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب سے گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ مگر سلمہ کو دیکھ کر اپنی تکلیف کے باوجود وہ مسکرادی اور اندھیرے جھونپڑے میں اُس کے دانت ایسے چمکے جیسے سمندر کی تہ میں سیپ۔ مچھیرن نے مرہٹی میں کچھ کہا۔
انور نے ترجمہ کیا۔
وہ کہہ رہی ہے ــــ "بہن! بھگوان کرے یہ دن ہمیں بھی جلدی نصیب ہو۔"

●

اور مچھیرن پھر اپنے حیات آفریں کرب میں مبتلا ہو گئی۔ پسینہ، خون اور پھر جیسے مداری

ٹوپی میں سے خرگوش نکالتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں گوشت کا ایک لوتھڑا۔ مگر بے جان ــــ کوئی حرکت نہیں، کوئی آواز نہیں۔ ماں کی آنکھیں بھی بند۔ شاید وہ بھی مر گئی اور پھر ڈاکٹر نے اس گوشت کے لوتھڑے کو زور سے ایک تھپڑ مارا اور جھونپڑے میں ایک ننھی سی آواز نے اپنی زندگی کا اعلان کیا۔ مری ہوئی ملی کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ خوشی سے چمک اٹھیں ــــ ڈاکٹر نے اس ننھے سے زندہ پتلے کو لے کر اس نے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

سلمہ نے اپنے گال پر گرم گرم آنسوؤں کو محسوس کیا۔

"مرمر کے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے۔" وہ آنسوؤں کو پیتے ہوئے بولی "جُمنیا کے بابو سچ کہیں تھے۔"

"ازھے بابا؟" مچھیرن نے مرہٹی میں سوال کیا۔

وہ پوچھتی ہے کہ اس کے بابا کا کیا ذکر ہے" انور نے ترجمہ کیا۔

اور اب سلمہ نے زمین پر بیٹھتے ہوتے مچھیرن کا سیاہ مگر چکنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ہاتھ لے کر پوچھا ــــ

"بہن! تمہارا نام کیا ہے؟"

"ازھا نام؟" اس نے دہرایا اور سلمہ نے دوستی محبت اور تشکر کی ایک گرم اور نرم لہر کو اس کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں دوڑتے ہوتے محسوس کیا اور اسے ایسے لگا جیسے اپنے بچپن سے اس کا بیس برس پہلے کا ٹوٹا ہوا رشتہ آج پھر سے قائم ہو گیا ہے۔ پھر مچھیرن بولی "مازھا نام۔ جُمنیا ــــ"

# ماں کا دل

ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

سٹوڈیو میں حسبِ معمول ہنگامہ تھا۔ ہیرو کے سر پر نقلی بالوں کی "وگ" بٹھائی جا رہی تھی۔ ہیروئن بار بار آئینہ میں اپنی لپ سٹک کا معائنہ کر رہی تھی۔ ڈائریکٹر کبھی ڈائیلاگ رائٹر سے اُلجھ رہا تھا کبھی کیمرہ مین سے۔ پروڈکشن مینیجر اکسٹرا سپلائر سے ایک کونے میں اپنی کمیشن طے کر رہا تھا۔

کیمرہ مین کے اسسٹنٹ نے روشنیوں کے کالے شیشے میں سے دیکھ کر کیمرہ مین سے کہا۔ "شاٹ ریڈی" کیمرہ مین نے اپنے کالے شیشے میں سے سین کا معائنہ کر کے ڈائرکٹر سے چلا کر کہا "شاٹ ریڈی"

ڈائرکٹر نے ہیرو کی کرسی کے پاس جا کر دھیرے سے کہا۔ "شاٹ ریڈی"

ہیرو نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیا۔ پھر دو آئینوں میں اپنے سر کو آگے پیچھے سے دیکھا۔ وگ کو دو تین بار تھپ تھپایا۔ نقلی بالوں کی ایک لٹ کو ماتھے پر گرایا اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی طرف دیکھ کر (جو ڈائلاگ کا فائل لئے کھڑا تھا) ہیرو نے پوچھا۔ "پکچر کون سی ہے؟"

"ماں کا دل۔"

"سین کون سا ہے؟"

"جی یہ وہ بچے والا سین ہے۔"

"بچے والا سین؟ مگر اس فلم میں تو میری شادی ہی نہیں ہوئی۔ بچہ کیسے ہو گیا؟"

"جی نہیں یہ آپ کا اپنا بچہ نہیں ہے۔ راستہ چلتے آپ کو ایک لاوارث بچہ مل جاتا ہے۔ بچے کو دیکھ کر آپ کو اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے، اپنی ماں یاد آ جاتی ہے، آپ بچے کو گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو جاتے ہیں اور آپ بولتے ہیں....."

"ہاں تو ڈائیلاگ سناؤ۔" اور یہ کہہ ہیرو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے فوراً فائل کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"یہ بچہ بھی کسی کی آنکھ کا نور ہے...."

ہیرو نے پوچھا۔ "نور؟ نور کیا ہوتا ہے؟"

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے پنسل سے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "جی۔ نور۔ نور تو بس نور ہوتا ہے۔ جیسے نور محمد، نور الحسن وغیرہ۔ دراصل رائٹر نے نور کا قافیہ سرور سے ملایا ہے۔"

"پورا ڈائلاگ پڑھو۔"

"یہ بچہ بھی کسی کی آنکھوں کا نور ہے، کسی کے دل کا سرور ہے، اگر آج یہ بھوکا ہے، مجبور ہے تو یہ سماج کا قصور ہے۔ کل یہی بچہ بڑا ہو کر ڈاکٹر، وکیل یا پلیڈر بن سکتا ہے....."

"یہ سب کیا بکواس ہے؟" ہیرو نے کہا اور پھر ڈائرکٹر کی طرف مخاطب ہو کر "اتنا بڑا ڈائلاگ مجھے یاد بھی نہیں ہو گا۔"

ڈائرکٹر نے کہا۔ "مجھے بھی ڈائلاگ ضرورت سے زیادہ لمبا لگتا ہے۔" اور پھر ڈائلاگ ڈائرکٹر سے "کمار صاحب جیسا کہتے ہیں اُسے چھوٹا کر دو۔"

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے ڈائلاگ کے پورے صفحے پر نیلی پنسل سے کانٹی کا نشان بناتے ہوئے کہا۔ "کمار صاحب آپ ہی بتا دیتے نا۔"

ہیرو نے سوچ کر کہا۔ "تو لکھو۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے....."

"جی؟ آگے؟"

"بس اور کچھ نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہراتے۔ "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل کا ہے۔ واہ واہ کیا بات کہی ہے۔ کمار صاحب آپ کو تو رائٹر ہونا چاہیئے تھا۔" اور پھر ڈائرکٹر سے مخاطب ہو کر "سر یہ تو بچہ کا تھیم ڈائلاگ ہو۔"

"تو پھر چلئے شاٹ تیار ہے۔" ڈائرکٹر نے ہیرو کو اشارہ کیا اور جیسے ہی ہیرو اپنی کرسی سے اُٹھا اور سب بھی کھڑے ہو گئے۔

"بچہ لاؤ" پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی آواز گونجی۔
"بچہ لاؤ" دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔
"بچہ لاؤ" تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے آواز دی۔
"سپلائر!" پروڈکشن منیجر نے نعرہ لگایا "بچہ کہاں ہے؟"
"مسز جانسن" اکسٹرا سپلائر چلایا۔
ایک موٹی تازی اینگلو انڈین عورت جو نہ جوان تھی، نہ بوڑھی آگے بڑھی۔ اس کی گود میں ایک بھورے بالوں والا گول گول چہرے گول گول آنکھوں والا بچہ تھا جو نائلون کا فراک پہنے ہوئے تھا۔
"اس کا فراک تو بہت بڑھیا لگتا ہے۔ غریب بچے کا فراک ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے اعتراض کیا۔ "ستیہ جیت رے کی فلموں میں دیکھئے کتنی ریالزم (REALISM) ہوتی ہے۔"
"ڈریس مین!" دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔
"جی صاحب" ڈریس مین نے جواب دیا۔
"بچے کا فراک بدلی کرو۔ کوئی میلا پھٹا ہوا کپڑا پہناؤ۔" پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے حکم دیا۔
ڈریس مین نے ایک بکسے میں ہاتھ ڈالا اور چند میلے گندے چیتھڑے لئے ہوئے بچے کی طرف بڑھا۔ بچے کی ماں نے جیسے ہی اُن گندے چیتھڑوں کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے بچے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ "نو۔ نو۔ ہمارا بے بی ایسا ڈرٹی کپڑا نہیں پہنے گا۔ کوئی بیماری لگ گئی تو....."
"مگر میم صاحب دیکھئے ریالزم (——— REALISM ———) کے لئے ضروری ہے ——" تیسرے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے کہنا شروع کیا۔
بچے کی ماں بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "ہمارا بے بی اونلی ہائی کلاس پکچرز میں کام کرتا ہے۔ ہم سپلائر کو پہلے ہی بولا تھا ہمارا بے بی گندا کپڑا نہیں پہنے گا۔"
ڈائرکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کیا "رہنے دو۔ آج کل غریبوں کے بچے بھی نائلون کے کپڑے پہنتے ہیں۔"
کیمرے کے سامنے کھڑے ہوئے ہیرو نے میم صاحب کی گود کی طرف ہاتھ پھیلاتے۔ "کم آن بے بی۔"
بچہ ہمک کر ہیرو کی گود میں چلا گیا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ فلمی دنیا کا محاورہ ہے کہ شوٹنگ کرتے وقت تین مصیبتیں آسکتی ہیں۔ گھوڑا، کُتا، اور بچہ۔"
میم صاحب نے اپنے بھورے گھنے بالوں کو تھپکی دیتے ہوئے ہیرو کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہا" ہمارا بے بی سویٹ ہے نا؟ بڑا ہو کر یہ بھی فلم کا ہیرو بنے گا۔"

کیمرہ مین نے ایک لائٹ کو بائیں سے ذرا دائیں سرکایا پھر واپس بائیں کو سرکا کر اُسی جگہ رکھ دیا پھر کیمرہ کی آنکھ میں جھانک کر دیکھا۔" کمار صاحب ذرا آگے..... بس بس بس..... بالکل ٹھیک ہے" اور پھر چلا کر۔" ریڈی فار ساؤنڈ ٹسٹ"

ساؤنڈ اسسٹنٹ نے مائکروفون آگے بڑھایا۔" کمار صاحب۔ ڈائلاگ بولئے گا ایک بار"

ہیرو نے مائیکروفون کی طرف پیار بھری نظر سے دیکھا اور کہا۔" یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے"

" ہاوز یٹ؟" تینوں اسسٹنٹ ایک ساتھ چلائے جیسے کرکٹ کے میدان میں کسی کھلاڑی کو ( L.B.W ) کرنے کے لئے سب فیلڈرز چلا کر امپائر سے پوچھتے ہیں۔" ہاوز دیٹ"

ساؤنڈ روم سے لاوڈ سپیکر کے ذریعے جواب آیا۔" اوکے۔ ریڈی فار ٹیک"

پہلا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔" خاموش"

دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔ سائلنس!"

تیسرا اسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا" بات چیت بند"

ڈائرکٹر نے کہا۔" ساؤنڈ سٹارٹ"

ساؤنڈ روم سے جواب آیا" کیمرہ"

کیمرہ مین نے بٹن دبا کر کہا" رننگ" ( RUNNING )

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ پھر کیمرے کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ کر بولا ـــــ " یہ بچہ بھی کسی ......... "

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بچے نے ہیرو کے ماتھے پر گری بالوں کی لٹ پر ایک جھپٹا مارا اور وِگ اس کے ہاتھ میں آگئی۔ ہیرو کی گنجی چندیا سٹوڈیو لائٹس کی روشنی میں چمک اُٹھی۔

ڈائرکٹر گھبرا کر چلایا" کٹ! کٹ!"

پہلا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔" کٹ اِپ!"

دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔" کٹ اِپ!"

تیسرا اسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔" میک اَپ۔ ہیر ڈریسر کو بلاؤ"

تین نوجوان کالج کی لڑکیاں جو کمار کی" فین" ( FAN ) تھیں اور خاص طور سے اُس کی شوٹنگ دیکھنے آئی تھیں یہ دیکھ کر بھوچکا رہ گئیں کہ اُن کے محبوب ایکٹر کے سر کی چندیا بالکل صاف تھی ـــــ اور انڈے کی طرح سفید۔

" ہائے رام"! ایک نے دوسری سے کہا۔" یہ تو گنجا ہے!"

دوسری نے" شش شش" کر کے کہا" آہستہ بولو کہیں سُن نہ لیں"

کمار غصے میں سیدھا سٹوڈیو کے باہر جا چکا تھا اور اب اُس کے پرائیوٹ میک اَپ روم میں ہیئر ڈریسر دوبارہ اُس کی "وِگ" کو فٹ کر رہی تھی۔

"اس بار میں چار ہیئر کلپ لگا دیتی ہوں تاکہ کھینچنے پر بھی وِگ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔"

مگر کمار نے غصّے سے کہا: "میں اُس بچے کے ساتھ کام نہیں کروں گا"

جب دوبارہ وِگ لگوا کر ہیرو واپس سٹوڈیو میں پہنچا تو ڈائرکٹر بے بی کی ممی سے کہہ رہا تھا۔ "سوری میم صاحب۔ آپ کے بچّے کو اب چھٹی۔ آگے کسی سین میں ہم ضرور اس کے لئے کوئی کام نکالیں گے۔"

"دیٹس آل رائٹ ( THATS ALL RIGHT ) میم صاحب بولیں۔" ہم کو مالوم ہے شوٹنگ میں ایسا گول مال ہو جاتا ہے۔ اپنے مینجر کو بولو ہمارا چکتا کر دو۔"

پروڈکشن مینجر نے اکسٹرا سپلائر کو ساٹھ روپے دے کر پچھتر روپے کی رسید لی۔ سپلائر نے میم صاحب کو چالیس روپے دے کر پچپن کی رسید لی۔ میم صاحب بچے کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ ہی رہی تھیں کہ بے بی نے ایک اور جھپٹا مارا اور اپنی ماں کے سر سے اس کی "وِگ" بھی کھینچ لی۔ میم صاحب نے جلدی سے اپنے نقلی بالوں کو دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا اور جب اطمینان ہو گیا تو بولیں "یو نائٹی بے بی۔ ڈرائیور ہم کو دادر سٹیشن چھوڑ دینا۔ اُدھر سے ہم بائیکلہ ٹرین میں جائے گا۔"

سٹوڈیو میں پھر ہنگامہ تھا۔

ڈائرکٹر پہلے اسسٹنٹ سے کہہ رہا تھا۔ "دوسرا بچہ لاؤ۔"

پہلا اسسٹنٹ پروڈکشن مینجر سے کہہ رہا تھا "دوسرا بچہ لاؤ۔"

پروڈکشن مینجر نے اکسٹرا سپلائر کو کونے میں لے جا کر کہا "آج تو تیری چاندی ہو رہی ہے۔ ایک بچہ اور لے آ۔ جتنا شہر بڑا ہو اچھا ہے۔ ایک دو اور بچوں کا بھی انتظام کر رکھنا۔"

اکسٹرا سپلائر پروڈیوسر کی موٹر لے کر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک تین چار برس کا موٹا تازہ بچہ لے کر آ گیا۔ ساتھ میں ایک کالا سا موٹا سا لمبے لمبے بالوں والا پہلوان نما آدمی۔ دھاریوں والی بنیان اور چار خانے کا تہمد باندھے۔

"ہم حاضر ہیں جی۔" پہلوان نما آدمی نے ڈائرکٹر کو ایک فوجی سلام مارتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟"

"آپ نے نہیں پہچانا۔ میں ماسٹر گُٹّل ہوں۔ انڈسٹری کا پُرانا آدمی ہوں۔ شہزادہ گلفام میں ولین کیا ہے۔ باغی شہزادی میں سائڈ ہیرو تھا۔ لال گھوڑا میں سائڈ ولین۔ اب بھی کیرکٹر کر لیتا ہوں بولئے کیا حکم ہے؟ ہم حاضر ہیں۔"

ڈائرکٹر نے چڑ کر کہا۔ "ابھی ہمیں اس وقت صرف ایک بچّے کی ضرورت ہے۔"

"بچہ بھی حاضر ہے، سرکار" یہ کہہ کر پہلوان نما آدمی نے بچے کو آگے کر دیا۔
"اے ڈائرکٹر صاحب کو سلام کرو"
بچہ ہرے رنگ کی مخمل کا نیکر اور بش شرٹ پہنے تھا۔ ہاتھ میں ایک جھنجھنا لئے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ بچوں جیسا نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی جادوگر نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو چھوٹے قد کا بنا دیا ہو۔ باپ کا حکم سنتے ہی اُس نے بھی ایک فوجی سلام کیا اور ماتھے سے ہاتھ نہ ہٹایا جب تک باپ نے اگلا حکم نہ سنایا۔
"ابھی صاحب کو ٹوسٹ کر کے بتاؤ بیٹا"
اور وہ بچہ جس کا چہرہ بچوں جیسا نہیں تھا۔ دفعتاً ٹوسٹ کرنے لگا جیسے وہ چابی والی گڑیا ہو۔
"شاباش بیٹا۔ شاباش" باپ ٹوسٹ کی لے پر تالیاں بجاتا ہوا بولا۔ بچہ تھرک رہا تھا۔ اپنے کو ہلے مٹکا رہا تھا۔ کبھی آگے بڑھتا تھا۔ کبھی پیچھے ہٹتا تھا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔
آہستہ آہستہ سیٹ پر جتنے لوگ جمع تھے وہ بچے کا ٹوسٹ ڈانس دیکھنے لگے۔ کیمرہ مین۔ اس کے اسسٹنٹ۔ لائٹوں والے چھوٹے موٹے کیرکٹر ایکٹر۔ اکسٹرا۔
تب پروڈیوسر نے ڈائرکٹر کے کان میں کہا "یہ سب بند کرو۔ کمار جی کو دن بھر کی شوٹنگ کا دس ہزار دینا ہے اور شارٹ اب تک ایک نہیں ہوا۔"
ڈائرکٹر نے چلا کر کہا۔ "کٹ اِٹ۔"
ٹوسٹ ڈانس کرتے کرتے بچہ ایک دم رُک گیا جیسے اس کی چابی ختم ہو گئی ہو۔
ڈائرکٹر نے پہلے اسسٹنٹ کو حکم دیا "کمار جی کو بلاؤ"
پہلے اسسٹنٹ نے دوسرے اسسٹنٹ کو حکم دیا "کمار جی سے کہو بچہ آگیا ہے۔ شاٹ تیار ہے"
تیسرا اسسٹنٹ میک اپ روم کی طرف بھاگا۔
ہیرو نے سٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "بچہ کہاں ہے؟"
ہری رنگ کی نیکر والے بچے نے ہیرو کو فوجی سلام مارتے ہوئے کہا۔
"گڈ مارننگ، ہاؤ ڈو یو ڈو؟ اور یہ کہہ کر ہیرو کی طرف دیکھ کر اتنے زور سے آنکھ ماری کہ ہیرو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔
ہیرو نے بچے سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں پہلوان کام کرو گے؟ گھبراؤ گے تو نہیں"
بچے نے تتلاتے ہوئے جواب دیا "گھبلائیں گے تو آپ؟ اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہیرو نے کھسیانا ہو کر پوچھا۔ "کیا اس آفت کے پرکالے کو مجھے گود میں اٹھانا ہو گا؟"
کیمرہ مین چلایا۔ "ریڈی فار ٹیک"

مختلف آوازیں سٹوڈیو میں گونجیں "ریڈی فار ٹیک۔ آل لائٹس۔ میک اپ ہیر ڈریسر۔ساؤنڈ لسٹ"۔
ہیرو نے کہا۔"ٹھہرو بھائی۔ پہلے میں اس پہلوان کو اٹھا کر دیکھتا ہوں"۔
ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھا لیا ـــ لیکن بچہ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ ہیرو ہانپنے لگا۔
"ساؤنڈ اسٹارٹ" ڈائرکٹر نے آواز دی۔
"کیمرہ"۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ کی آواز آئی۔
"رننگ!" ( RUNNING )کیمرہ مین نے اعلان کیا۔
ہیرو نے بچے کی طرف پیار بھری آنکھوں سے دیکھا۔ بچے نے آنکھ ماری۔ ہیرو کی زبان سے نکلا۔
"یہ بچہ بھی ۔۔۔۔ یہ بچہ بھی ۔۔۔۔ اور پھر اس کے بجائے بچہ بولا۔"کیوں بیٹا ڈائلاگ بھول گئے نا؟"
ہیرو کو ایسا لگا جیسے اس کی گود میں آدمی کا بچہ نہ ہو، کسی راکشس کا بچہ ہو اور اس نے "کٹ اِٹ" کہہ کر بچے کو اس کے باپ کی طرف پھینکا۔
اور سو پہلوان صاحب بھی دس دس روپے کے چھ نوٹ جیب میں ڈال کر بچے کا ہاتھ پکڑے وہاں سے رخصت ہو گئے۔
تیسرا بچہ لایا گیا۔ اس نے شاٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ہیرو کے سوٹ پر پیشاب کر دیا ـــ ہیرو نے کہا میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔"
چوتھا بچہ لایا گیا۔ یہ دیکھنے میں بڑا بھولا بھالا اور معصوم تھا۔ سب کو یقین تھا۔ اب شاٹ بخیر و خوبی ہو جائے گا لیکن جیسے ہی ہیرو نے اُسے گود میں لیا، بچہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بچے کو ماں کی گود میں واپس دیا گیا تو فوراً چپ ہو گیا۔ دوبارہ ہیرو کی گود میں دیا تو چپکے سے چلا گیا۔ لیکن جیسے ہی کیمرہ چلنا شروع ہوا اور ہیرو نے ڈائلاگ بولا "یہ بچہ بھی ۔۔۔۔" کہ بچے نے نہ صرف رونا شروع کر دیا بلکہ اپنے ننھے سے پاؤں سے اتنے زور کی لات ماری کہ ہیرو کی آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی ـــــ ہیرو نے فیصلہ سنا دیا۔
"میں اس بچے کے ساتھ بھی کام نہیں کروں گا۔ یا تو کوئی سیدھا سادا چُپ چاپ بچہ لاؤ۔ نہیں تو سین کینسل کرو۔ گھنٹہ بھر میں شوٹنگ شفٹ بھی ختم ہونے والی ہے۔"
سپلائر نے کہا۔" اب میں کب تک بچے لاتا رہوں؟۔ اس طرح تو ساری بمبئی کے بچے ختم ہو جائیں گے"۔
پروڈکشن مینجر نے کہا۔" تجھے کیا؟ تیری تو چاندی ہو رہی ہے ۔۔۔۔"
"اور تمہاری نہیں؟" سپلائر نے چڑ کر کہا۔
"اچھا بھئی ہم دونوں کی۔ اب ایک چپ چاپ سا بچہ لے آ کہیں سے"۔
"میں تو جتنے فلمی بچوں کو جانتا ہوں سب کو لے آیا۔ ہر ماں اپنے بچے کو فلم میں کام کرنے نہیں

بھیجتی۔ یہی دو چار لوگ ہیں جو اپنے بچوں کا دھندا کرتے ہیں۔"

"ارے بھئی پیسوں کی خاطر کوئی بھی اپنے بچے کا دھندا کر سکتا ہے۔"

یہ بات کرتے کرتے وہ سٹوڈیو کے باہر نکل آئے تھے۔ جہاں ایک بھنگن سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی۔

"اری ذرا ٹھہر" پروڈکشن مینیجر چلایا۔ "سارے میں مٹی اُڑا رہی ہے۔ یہ وقت ہے جھاڑو دینے کا۔ صبح سویرے کیوں نہیں جھاڑو دی۔"

"بابو جی۔ آج مجھے دیر ہو گئی تھی۔"

"دیر ہو گئی تھی تو پگھار کٹے گی۔ کوئی مفت کام کرتی ہے کیا؟"

"بابو جی" بھنگن کام بند کر کے گڑگڑاتی ہوئی بولی۔ "میرا بچہ بیمار ہے۔"

"بیمار ہے۔ کیا بیمار ہے؟"

"بابو جی۔ پتہ نہیں کیا بیمار ہے۔ دس دن سے بُکھار نہیں اُترا۔"

"تو پھر ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتی؟"

"محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا تھا، بابو جی۔ دو روپے فیس بھی دی تھی۔ وہ کہیں اسے بچوں والے بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ اُن کی فیس بیس روپے ہے۔ پھر دوا انجکشن کے لئے بھی دام چاہئیں۔ اگلے مہینے کی پگھار مل جاتی ــــ تو بچے کا اِلاج ہو جاتا۔"

"جا بچے کو لے آ۔ اس کے علاج کے لئے روپے مل جائیں گے۔ پورے چالیس" اِکسٹرا سپلائر نے پروڈکشن مینیجر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

پروڈکشن مینیجر بولا "اری تیرے بچے کا فلم میں فوٹو آجائے گا کمار جی کے ساتھ اور پیسے بھی ملیں گے جلدی سے لے آ۔"

"ابھی لاتی ہوں، بابو جی ......" بھنگن نے جھاڑو ٹوکری پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر سن، بچہ روئے گا چلائے گا تو پیسے نہیں ملیں گے۔ چُپ چاپ رہنا چاہیے۔"

بھنگن سٹوڈیو کے پیچھے ہی ایک جھونپڑیوں کی بستی میں رہتی تھی۔ اپنی جھونپڑی میں جانے سے پہلے اس نے پڑوسن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کیا ہے چاؤلی؟"

"بچہ بہت روتا ہے بہن۔ مجھے کام پر جانا ہے۔ وہ دوا دے دو جو تم کام پر جاتے ہوئے اپنے بچے کو دیتی ہو۔"

پڑوسن نے ایک پُڑیا پکڑا دی۔ "بس تھوڑی سی پانی میں گھول کر دیجیئو۔"

چاؤلی اپنے جھونپڑے میں گئی۔ بچہ جھنگا چارپائی پر اکیلا لیٹا رو رہا تھا۔ چاؤلی نے بیٹے کو گود میں لے لیا۔ بدن جل رہا تھا۔ روئے ہی جا رہا تھا۔ چاؤلی نے بھینچ کر بچے کو پیار کیا۔ "نا رو میرے لال۔ چل میں تجھے فلم کمپنی میں لے چلتی ہوں۔ میرا بیٹا فلم کا ہیرو بنے گا۔ پھر تجھے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤنگی"

"نا رو میرے لال۔۔۔ نہ رو" یہ کہہ کر اس نے پانی میں گھلی ہوئی کالی کالی دوا بچے کو چٹا دی۔ بچہ روتے روتے ہلکان ہو کر اب ہچکیاں لینے لگا تھا۔ ہچکیاں لیتے لیتے نڈھال ہو کر سو گیا۔ چاؤلی نے بچے کو چند چیتھڑوں میں لپیٹا اور سٹوڈیو کی طرف چل دی۔

اکسٹرا اسپلائر نے کہا۔ "روئے گا تو نہیں"۔

چاؤلی نے کہا "نہیں بابوجی مجے سے سو رہا ہے۔

ڈائرکٹر نے پوچھا۔ "اے یہ روئے گا تو نہیں؟"

پروڈکشن مینجر نے کہا "نہیں صاحب۔ بڑا شریف بچہ ہے۔ ماں کا دودھ پی کر مزے سے سو رہا ہے آپ جتنے چاہیں شاٹ لیجئے۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں لینے سے پہلے پوچھا۔ "روئے گا تو نہیں؟"

"نہیں کمار جی"۔ ڈائرکٹر نے اُسے یقین دلایا۔ بڑا خاموش بچہ تلاش کر کے منگوایا ہے"۔

ہیرو نے بچے کو گود میں لے لیا اور سوچا۔ "شکر ہے اس کا وزن زیادہ نہیں ہے"۔ پھر وہ بولا۔ "جلدی شاٹ لے لو۔ ابھی تو سو رہا ہے اُٹھ گیا تو یہ بھی ناک میں دم کرے گا۔"

"ریڈی فار ٹیک"۔

"ریڈی فار ٹیک؟"

"آل لائٹس"۔

"ساؤنڈ ریڈی؟

"سٹارٹ ساؤنڈ۔"

"کیمرہ۔"

"رننگ۔ کلیپ"

ماں کا دل۔ سین نمبر ۵۵ چھپن۔ ساٹ نمبر سیون۔ ٹیک نمبر فور"۔

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اس کے چہرے کو دیکھا۔ بچہ اطمینان سے آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ اُس کے معصوم چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ہیرو نے کیمرہ کی طرف دیکھ کر دل کی گہرائی سے آواز نکالی "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

شاٹ کٹ ہو گیا۔ مگر کیمرہ مین نے کہا ایک ٹیک اور چاہیئے۔ بچے کے چہرے پر روشنی ٹھیک نہیں

پڑی تھی۔

ایک اور بار شاٹ دہرایا گیا۔ ایک بار پھر ہیرو نے کہا۔ "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے"۔

اسی وقت ایک ہوائی جہاز سٹوڈیو کے اُوپر سے گو بجتا ہوا گزر گیا۔ لاؤڈ سپیکر میں سے ساؤنڈ رکارڈسٹ کی آواز آئی۔ "کٹ کٹ۔" ہوائی جہاز۔

کسی نہ کسی وجہ سے تین بار اور شاٹ دہرایا گیا۔ ٹیک نمبر نو کو "اوکے" کیا گیا۔

ہیرو نے بچہ پروڈکشن مینیجر کے حوالے کیا۔ بچہ اب تک سو رہا تھا۔

پروڈکشن مینیجر نے بچہ اکسٹرا سپلائر کی گود میں دیا۔

اکسٹرا سپلائر نے چاؤلی کی گود میں بچہ دیا اور ساتھ ہی چالیس روپے دے کر اُس سے پچھتر روپے کی رسید پر انگوٹھا لگوا لیا۔

"جا اب اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا اور اچھی طرح علاج کروا۔"

"بابو جی۔ بیدھی وہیں جاتی ہوں۔ ٹیکسی کر کے۔ آپ کی کرپا سے اِس کا اِلاج ہو جاتے گا۔ آپ کے بچے جیئیں"۔

بچوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر کے سکریٹری نے پہلے فیس لے لی۔ پھر ڈاکٹر نے بچے کا معائنہ کیا۔

"مگر یہ تو مر چکا ہے۔" ڈاکٹر نے ہاتھ لگاتے ہی کہا۔ اور چاؤلی کو ایسے لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا چھا گیا ہے۔ پھر بھی وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "ڈاکٹر صاحب کیا ہوا میرے لال کو۔ اُسے تو صرف بُخار آ رہا تھا"۔

"بخار سے نہیں، لگتا ہے تمہارا بچہ زہر سے مرا ہے۔ کیا دیا تھا اسے کھانے کو؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب! جراسی افیم دی تھی چُپ کرانے کو"۔

---

سال بھر بعد "ماں کا دِل" کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک بڑے نیتا نے تقریر کرتے ہوئے کہا "میں اس فلم کے پروڈیوسر، ڈائرکٹر، ہیرو اور ہیروئن کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اُن کی فلم میں سچ مچ ایک ہندوستانی ماں کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔"

# آج کے لیلیٰ مجنوں

ایک تھی لیلیٰ، ایک تھا مجنوں۔

مگر لیلیٰ کا نام لیلیٰ نہیں تھا، للی تھا، للی ڈی سوزا۔

اور مجنوں کا نام مجنوں نہیں تھا۔ موہن تھا۔ موہن ماہیکر۔

وہ دونوں اور اُن کے قبیلے صحرائے عرب میں نہیں رہتے تھے۔ ماہم اور باندہ کے بیچ میں سڑک کے نیچے اور کھاری پانی کی کھاڑی کے کنارے جو جھونپڑیوں کی بستی ہے وہاں رہتے تھے۔

مگر صحرائے عرب کی طرح اس بستی میں بھی پانی کی کمی تھی۔ ڈیڑھ سو جھونپڑیوں میں جو سات ہزار مرد عورتیں اور بچے رہتے تھے اُن سب کے لئے میٹھے پانی کا صرف ایک نل تھا اور اس نل میں صرف دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کو پانی آتا تھا۔ ایک کلسٹر یا ایک گھڑا پانی لینے کے لئے کئی کئی گھنٹے پہلے سے لائن لگانی پڑتی تھی۔

ایک رات کو موہن جھونپڑی میں اپنے باپ کی کھٹیا کے نیچے سو رہا تھا کہ اس کی ماں نے اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔

"موہن، اے موہن! جا، نل پر اپنی گاگر لائن میں رکھ کے آ، نہیں تو پانی نہیں ملے گا۔"

موہن کی عمر اس وقت مشکل سے نو برس کی ہوگی اور نو برس کے بچے کو جو دن بھر کیچڑ مٹی میں

دوڑتا بھاگتا رہا ہو، بڑی پکی نیند آتی ہے۔ آدھی رات کو اُسے اُٹھانا آسان نہیں ہے۔

"ارے او موہن۔ اُٹھتا ہے یا نہیں"۔ ماں نے ایک بار پھر اُسے جھنجھوڑا ——

"سونے دو نہ ماں۔ ابھی تو آدھی رات ہوئی ہے۔ نل میں پانی تو صبح آٹھ بجے آئے گا۔"

"اچھا تو سوتا رہ۔ ابھی تیرا بابا آتا ہے وہ اُٹھاتے گا تجھے"۔

بابا کا نام سنتے ہی موہن ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دُنیا میں وہ کسی سے ڈرتا تھا تو اپنے باپ سے اور خاص کر رات کو جب وہ دارو پی کر گھر لوٹتا تھا۔

"اچھا اماں، میں جاتا ہوں"۔ آنکھ ملتا ہوا وہ اُٹھا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر گاگر اٹھائی اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

ساری بستی اندھیرے میں سوئی ہوئی تھی۔ مگر سڑک کی پیلی روشنی نل کے پاس زمین پر رکھے ہوئے کنستروں، گاگروں اور گھڑوں پر پڑ رہی تھی۔

موہن نے سوچا سچ مچ مجھے بڑی دیر ہو گئی۔ یہاں تو سب پہلے ہی اپنے اپنے برتنوں کی لائن لگا گئے ہیں۔ اس طرح تو نل میں پانی آٹھ بجے آیا تو اپنا نمبر آتے آتے دس بج جائیں گے اور اس وقت تک پانی آنا بند ہو گیا تو.....؟

موہن نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ صرف نل سے لے کر بستی کے پچھلے کونے بلکہ سڑک تک پانی کے برتنوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ پہلے ایک چمکتی ہوئی گاگر، پھر ایک لال مٹی کا گھڑا، پھر ایک پرانا زنگ لگا کنستر، پھر ایک ڈالڈا کا خالی ٹین، پھر ایک صراحی، ایک بالٹی، ایک کنستر، ایک گھڑا، دو گاگریں، تین ٹین کے ڈبے، دو بالٹیاں، ایک گاگر.....

موہن نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر سوچا، کسی کا برتن ہٹا کر اپنی گاگر آگے رکھ دُوں۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ بستی کے قانون کے مطابق ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں، تب ہی تو لائن میں اپنا برتن رکھ کر چین سے سو جاتے ہیں۔ نہیں تو ہر کسی کو رات بھر پہرہ دینا پڑے۔ پانی کے لئے لائن توڑنے پر تو مار پیٹ کیا خون خرابے ہو جاتے ہیں۔ سو اپنی گاگر کو سب سے پیچھے لائن میں ہی رکھنا چاہیئے۔ مگر پھر اُسے یاد آیا کہ اس کا نمبر آنے سے پہلے نل بند ہو گیا اور گھر میں پانی نہ پہنچا تو اُس کا باپ ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دے گا۔

کوئی پرواہ نہیں۔ اُس نے سوچا۔ سب سو رہے ہیں، میں چپکے سے اپنی گاگر آگے بڑھا دیتا ہوں اور وہ نل کی طرف بڑھا، مگر وہ کسی کا کنستر سرکانے والا ہی تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"اے چھالا کیا کلتا ہے؟"

موہن گھبرا کر مڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کالی سی، دُبلی سی، چھوٹی سی چھ سات برس کی بچی ایک

میلا پھٹا فراک پہنے ہاتھ میں اپنے قد سے بڑا بانس کا ڈنڈا لئے کھڑی ہے۔
"چھالا بے ایمانی کرتا ہے"۔ بچی ڈنڈا لئے موہن کی طرف بڑھی۔ "چل رکھ اپنی گاگل، لائن میں چھپ چپے پیچھے"۔
موہن کو اُس تو تلی چھوکری کی بات سُن کر ہنسی آ گئی۔ "اری جاجا۔ میں جہاں جی چاہے اپنی گاگر رکھوں گا۔ تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی"۔
یہ کہہ کر وہ گاگر رکھنے والا ہی تھا کہ وہ بولی "تو پھل میں چھول مچا کے چھپ کو بُلاتی ہوں۔ چھپ مال مال کے تمھا لا بھلکس بنا دیں گے"۔
موہن کا ہاتھ رُک گیا۔ وہ جانتا تھا اگر اُس چھوکری نے سچ مچ شور مچایا تو کیا ہو گا۔ ہر جھونپڑی سے لوگ لاٹھیاں، ڈنڈے، چاقو، چھرے، پتھر لئے ہوتے نکلیں گے اور کوئی سوال و جواب کئے بنا اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ صحرائے عرب کی طرح اس بستی میں بھی ایک چلّو پانی کے لئے دس چلو خون بہایا جا سکتا تھا۔
سو اس نے کہا "اچھا بابا تو چلا مت۔ میں اپنی گاگر لائن میں سب سے پیچھے رکھ دیتا ہوں"۔
مگر بچی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ وہ اپنا ڈنڈا گھسیٹتی ہوئی موہن کے پیچھے پیچھے آئی تاکہ وہ کوئی بے ایمانی نہ کر سکے۔
موہن نے لائن کے اخیر میں اپنی گاگر زمین پر رکھ دی اور بولا "بس اب تو ٹھیک ہے؟"
"ہاں، چھپ ٹھیک ہے۔ اب تم جا کے چھو جاؤ"۔
"پر یہ جگہ سڑک کے پاس ہے۔ کوئی راستہ چلتا میری گاگر اٹھا کر چلتا بنا تو؟"
"تم پھکل نہ کرو۔ میں جو ہوں"۔ اور یہ کہہ کر اس نے چوکیداروں کی طرح ڈنڈے کو زمین پر مار کر کہا "کوئی مہتالی گاگل کو ہاتھ بھی لگائے گا تو اُچھ کا چھل پھول دوں گی۔ ہاں!"
اور اتنی سی بچی کی اتنی بڑی بڑی باتیں سُن کر موہن بے اختیار مُسکرا دیا۔
بستی کے کنارے جہاں وہ کھڑے تھے۔ وہاں سڑک پر بجلی کا کھمبا لگا ہوا تھا اور اس کی روشنی کے دائرے میں وہ دونوں بچے کھڑے تھے۔ ساری دنیا اُس وقت سو رہی تھی، صرف محبت جاگ رہی تھی اور وہ دونوں..... ایک نو برس کا لڑکا ایک چھ برس کی لڑکی۔
للی اور موہن۔
موہن اور للی۔
موہن نے اس تو تلی کالی دُبلی چھوکری کی طرف دیکھا، جو پھٹا فراک پہنے، ننگے پاؤں، اپنے قد سے بڑا ڈنڈا لئے کھڑی تھی اور کھمبے کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جن آنکھوں سے وہ اُسے ٹکٹکی باندھے

دیکھ رہی ہے وہ بڑی بڑی اور خوبصورت ہیں جیسے اس ہرن کی آنکھیں جو اُس نے چڑیا گھر میں دیکھی تھی اور جس کے جنگلے پر لکھا ہوا تھا "عربستان کی ہرن"۔

اور للی نے موہن کی طرف دیکھا جو ایک میلی نیکر پر اپنے باپ کا پھٹا ہوا ایک بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس نے خاموش سناہٹ سے اپنے دل میں سوچا "یہ چھوکلا مجھے اچھا لگتا ہے، اچھ جھے میں دو چھنٹے کلوں گی۔ اب میں اچھے ڈنڈا نہیں مانگوں گی۔"

روشنی کے دائرے میں وہ دونوں ایسے کھڑے تھے جیسے ان کے ارد گرد کسی نے قسمت کا ایک حصار کھینچ دیا ہو جس سے باہر نکلنا اب اُن کے بس میں نہ ہو ـــــ اور پھر وقت رُک گیا اور وہ دونوں وہاں خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ نہ جانے کتنی دیر تک.....

شاید صرف ایک منٹ۔

شاید ایک سو برس۔

شاید پانچ منٹ۔

شاید پانچ سو برس۔

●

فادر ولیم کی لمبی سفید داڑھی ہوا میں ایسے اُڑ رہی تھی جیسے وہ اُڑتا ہوا کبوتر ہو، اور سامنے بیٹھے ہوئے سب بچے حساب کا سوال کرنے کی بجائے فادر ولیم کی داڑھی کا کھیل دیکھ رہے تھے جو کبھی ہوا کے جھونکے سے اپنے پر پھیلا لیتی تھی اور کبھی پامفریٹ مچھلی کی طرح گول اور سپاٹ ہو جاتی تھی۔ اُن کی کرسی کے پاس اُن کی بید کی چھڑی رکھی تھی۔ جس کی مار کا مزا ہر بچہ چکھ چکا تھا اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ فادر اُسے روز تیل میں بھگو کر لاتے ہیں، مگر اس وقت کسی کو مار کھانے کا ڈر نہیں تھا کیونکہ فادر ولیم کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُونگھ رہے تھے بلکہ شاید سو رہے تھے۔ صرف اُن کی داڑھی جاگ رہی تھی ـــــ

فادر ولیم دراصل "فادر" کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ کسی زمانے میں وہ پادری ضرور تھے، مگر انہیں رومن کیتھولک چرچ سے نکالا ملا ہوا تھا کیونکہ انھوں نے لاٹ پادری سے کہہ دیا تھا کہ چرچ کا کام عیسیٰ مسیح کا امن اور محبت کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ نہ ہندوؤں مسلمانوں یا ہریجنوں کو مختلف قسم کے لالچ دے کر اُن کو عیسائی بنانا۔ سو اُن کا پادریوں والا لمبا چوغہ اُن سے چھین لیا گیا تھا مگر اُن کی لمبی داڑھی لاٹ پادری بھی اُن سے نہ چھین سکے تھے اور اب وہ اس جھونپڑیوں کی بستی میں آسمان کے نیچے اپنا اسکول چلاتے تھے۔ جس میں وہ بچے پڑھتے تھے جن کو کسی سرکاری اسکول میں داخلہ نہ

بِلا ہو یا جن کے ماں باپ سرکاری یا بیوپاری سکولوں کی فیس نہ دے سکتے ہوں۔ فادر ولیم کے اسکول کا نہ کوئی نام تھا نہ اس میں میز کرسیاں، بنچ اور ڈیسک تھے۔ بس ایک ٹین ٹانگ کے کٹہرے پر لگا بلیک بورڈ تھا جس پر اسوقت موہن چاک سے فادر ولیم کی اُڑتی ہوئی سفید داڑھی کی تصویر بنا رہا تھا۔

اور دُور اپنی جگہ پر بیٹھی للی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے بلیک بورڈ کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں کالے تختے پر دھیرے دھیرے فادر ولیم کا گول چہرہ اور اُن کی ہوا میں بکھری ہوئی سفید داڑھی اُبھر رہی تھی مگر دراصل وہ اپنے موہن کی طرف دیکھ رہی تھی اور اب بغیر تتلاتے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی "میرا موہن کتنا اچھا ہے۔ اُس نے تصویر بھی بنائی ہے تو کتنی اچھی بنائی ہے۔ ایسا لگتا ہے فادر ولیم کی داڑھی اب اُڑی اَب اُڑی!"

ابھی موہن نے تصویر پُوری نہیں کی تھی کہ فادر ولیم جاگ پڑے اور سب بچے جو اب تک شور مچا رہے تھے یا آپس میں دھول دھپا کر رہے تھے، ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور زور زور سے سی اے ٹی کیٹ۔ کیٹ معنی بلی" کرنے لگے۔ مگر موہن کا منہ ابھی تک بلیک بورڈ کی طرف تھا۔ وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ فادر ولیم کے ساتھ ساتھ ان کی تیل میں بھیگی ہوئی چھڑی بھی اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔

"م۔م۔م۔ موہن!" للی اب ساڑھے سات برس کی ہو چکی تھی۔ اور اس نے تتلانا بند کر دیا تھا مگر موہن کو مار پڑے گی اس ڈر سے وہ ہکلاتی ہوئی چلائی۔ "م۔م۔م۔ موہن۔ ف۔ف۔ف۔ ا۔ در۔!"

موہن گھبرا کر مڑا اور ساتھ ہی اس کی کمر پر چھڑی کی مار پڑی۔

یہ دیکھ کر سب بچے کھکھلا کر ہنس پڑے۔ سب، سوائے ایک للی کے۔ اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا اور وہ دھیرے دھیرے فادر ولیم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"ہاتھ باہر نکالو موہن!" فادر ولیم نے ڈانٹ کر کہا، اور جب جب ڈر کے مارے موہن ہچکچایا تو انھوں نے ایک عجیب انداز سے (جس میں حکم بھی تھا اور التجا بھی) کہا۔

"ہاتھ نکالو۔ یو فول، ہاتھ باہر نکال ورنہ کہیں مار پڑی تو کسی ہڈی پر چوٹ آجائے گی۔"

سو موہن نے ہاتھ آگے کر دیا۔

فادر ولیم کی چھڑی ہوا میں اٹھی اور سڑاپ سے موہن کے ہاتھ پر پڑی۔

موہن نہیں چاہتا تھا کہ للی کے سامنے وہ کسی کمزوری یا بودے پن کا اظہار کرے۔ چھڑی کا نشان اس کے ہاتھ پر پڑ گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہتھیلی پر کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو مگر اس نے دانت کچکچائے اور اُس کے منہ سے اُف نہ نکلی۔

مگر چلتے چلتے للی چلا پڑی، جیسے مار اُسی کو پڑی ہو۔

"ون!"
"ٹو"
"تھری"
"فور"

فادر کی چھڑی چار بار ہوا میں اٹھی اور چار بار موہن کے ہاتھ پر پڑی، اور ہر بار موہن اپنے درد کو پی گیا اور ہر بار للی بے اختیار چلا پڑی۔

"دیٹ ول ڈو" ( THAT WILL DO ) فادر نے چھڑی واپس میز پر رکھتے ہوئے موہن سے کہا اور پھر اپنی لمبی سفید داڑھی پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ اب کبھی کوئی میری داڑھی کی تصویر بناتے تو یاد رکھے کہ میری داڑھی اتنی چھوٹی نہیں ہے جیسی موہن نے بنائی ہے۔ پورے ساڑھے تیرہ انچ لمبی ہے"

یہ سُن کر سب بچے ہنس پڑے۔ فادر ولیم بھی ہنس پڑے۔ موہن ہنس کر جلدی جلدی بلیک بورڈ کپڑے سے صاف کرنے لگا۔ تب فادر ولیم نے للی کو دیکھا جو آنکھیں پھاڑے فادر کو دیکھ رہی تھی۔

"ویل۔ للی تم کو کیا چاہیئے؟" فادر نے نرمی سے پوچھا۔

"فادر....."

"یس مائی چائلڈ!"

للی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیدھی بلیک بورڈ کے پاس گئی اور موہن سے چاک چھین کر خود اسی جگہ فادر ولیم کی تصویر بنانے لگی۔

سب حیرت سے دیکھتے رہے کہ للی کو دفعتاً نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

للی کی بنائی ہوئی تصویر نہ صرف اچھی نہیں تھی بلکہ کسی طرح سے فادر ولیم کی تصویر نہیں لگتی تھی۔ نہ فادر ولیم اتنے موٹے تھے، نہ وہ اتنے لمبے تھے، نہ اُن کے گلے میں اتنا بڑا کراس لٹکا رہتا تھا۔ نہ اُن کی آنکھیں اتنی بڑی اور ایسی بھیانک تھیں جیسی للی نے اپنی تصویر میں بنائی تھیں۔ مگر داڑھی کو للی نے بڑی احتیاط سے بنایا اور تصویر ختم کرتے ہوئے فادر ولیم کی طرف مڑ کر بولی۔ "اب آپ فٹ رول لے کر اپنی داڑھی کو ناپ لیجئے۔"

اس پر ساری کلاس کھلکھلا کر ہنس پڑی اور باوجود فادر ولیم کے اپنی بید سے میز کو دھڑ دھڑانے کے بچے ہنستے ہی رہے۔

اس سے خفا ہو کر فادر نے للی کی طرف مُڑ کر پوچھا "کون ہو تم؟"

للی نے کہا۔ "للی"

ایک چھوکرا کلاس کے پیچھے سے چلایا۔ "للی نہیں فادر، لیلیٰ!"

"سائنس" کلاس کو اچھی طرح سے گھور کر فادر نے للی سے کہا۔ "تم نے بھی یہی حرکت کی ہے؟ پھر تمہیں بھی وہی سزا ملے گی۔ نکالو، اپنا ہاتھ باہر۔"

للی نے اپنا ہاتھ کھول کر بڑھا دیا۔

اور فادر ولیم جو اس دنیا اور اُس دنیا دونوں کے سب جسمانی اور روحانی بھیدوں سے واقف تھے، یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گئے کہ للی کے ہاتھ پر چار گہری نیلی لکیریں پڑی ہوئی تھیں جیسے اس کی ہتھیلی پر پہلے ہی سے چار بار بید کی مار پڑ چکی ہو۔

●

للی شام کو دفتر سے باہر نکلی تو فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تین ٹیڈی بائیز (TEDDY BOYS) نے بہ یک وقت سیٹی بجائی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں للی تھی بھی سیٹی بجانے کے قابل۔ رنگت سانولی مگر خوبصورت آنکھیں۔ قدرتی گھونگریالے چمکیلے سیاہ بال، چھریرا مگر بھرا ہوا جسم جو اس کے چُست فراک میں اور بھی نمایاں نظر آتا تھا۔ اونچے فراک میں سے نکلی ہوئی سڈول ٹانگیں۔ ایسی لڑکی کو دیکھ کر بھلا کون سیٹی نہیں بجائے گا؟"

للی کو ٹیڈی بائیز کی سیٹی سننے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دن میں کئی بار اس کو اس قسم کی سیٹیاں سنائی دیتی تھیں۔ للی کو ان لفنگے چھوکروں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اگر اُسے دیکھ کر اُن کا جی سیٹی بجانے کو چاہتا ہے تو شوق سے سیٹی بجائیں۔ بڑی لاپرواہی سے وہ اپنا بیگ ہلاتی ہوئی اُن کے پاس سے گزر جاتی اور اُس کا یہ انداز دیکھ کر وہ بھی سیٹی بجانا بھول جاتے۔

لیکن آج اس کا موڈ خراب تھا۔ جیسے ہی ٹیڈی بائیز نے سیٹی بجائی، للی نے پلٹ کر دیکھا، پھر وہ اُن کی طرف بڑھی۔ اُس کی آنکھوں میں غصّے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی سیٹی کی آواز تینوں چھوکروں کے ہونٹوں پر سے غائب ہو گئی۔

"کیا ہے؟" اُس نے ڈانٹ کر کہا "شرم نہیں آتی، لوفر کہیں کے! کیوں، بلاؤں پولیس کو؟"

اور پولیس کا نام سنتے ہی تینوں تنگ مہری کی پتلونیں اور نکیلے جوتوں کے تینوں جوڑے وہاں سے بھاگتے ہوتے نظر آئے۔

"سوائن! انھیں بھاگتے دیکھ کر للی چلائی —— سور کہیں کے!"

پھر وہ بس سٹینڈ کی طرف چل پڑی۔ آج اس کا موڈ اتنا خراب تھا کہ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی اُونچی ایڑی کے سینڈل کی آواز میں بھی غصّہ بھرا ہوا لگتا تھا۔

"سوائن! سور کہیں کا" چلتے چلتے دانت بھینچ کر اُس نے اتنے زور سے کہا کہ آگے چلنے والے

ایک ادھیڑ عمر کے شریف آدمی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ مگر یہ گالی اس نے اس بے چارے کو نہیں دی تھی۔ نہ ہی یہ گالی اس نے ان ہڈی بوائز کو دی تھی، جن کی لوفرانہ حرکت کو وہ اب تک بھلا بھی چکی تھی۔ اِس وقت اس کو غصہ آرہا تھا اپنے دفتر کے مینجر پر، جو موٹا تھا اور گنجا تھا۔ مگر اپنے گنج کو چھپانے کے لئے کنپٹی کے لمبے بالوں کو گنجی کھوپڑی کے اُوپر چپکائے رکھتا تھا اور جس کی رنگت مینڈک کے پیٹ کی طرح پیلی تھی اور جس کے موٹے موٹے گدّے دار ہاتھ ہمیشہ ہوس کے پسینے سے بھیگے رہتے تھے اور جو دفتر میں کام کرنے والی ہر لڑکی سے فلرٹ کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔

للی کو اُس دفتر میں کام کرتے ہوئے صرف دو مہینے ہوتے تھے مگر اتنے عرصے ہی میں اُس نے مینجر کی بدنیت کو بھانپ لیا تھا اور اس لئے وہ جہاں تک ممکن ہوتا۔ اُس کے قریب جانے سے کتراتی رہتی تھی مگر اس دن مینجر نے اپنی سپیشل سینٹو گرافر کو چھٹی دے دی تھی اور للی کو اس کی جگہ کام کرنا پڑا تھا۔

تین گھنٹے تک للی نے شارٹ ہینڈ کی کتاب پر مینجر کے ڈکٹیٹ کراتے ہوئے خطوں کے ڈرافٹ لکھے تھے۔ ہر خط شروع ہوتا تھا۔ "ڈیر سر" یا "مائی ڈیر....." سے اور ہر بار جب اس کے منہ سے "ڈیر" کا لفظ نکلتا تھا، وہ ایک خاص انداز سے للی کی طرف دیکھتا تھا، جس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا مگر جس کو سمجھنے کے لئے للی تیار نہ تھی اور پھر شام ہوتے جب وہ ان سب خطوں کو ٹائپ کر کے دستخط کرانے لے گئی تھی، اُس بدمعاش نے للی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا "آج رات کے شو میں سینما دیکھنے کے لئے چلتی ہو؟" اور پھر اس نے للی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا، تاکہ اُسے اپنی گود میں بٹھا لے اور تب للی کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ مینجر کے ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرے اور ہاتھ چھڑا کر وہاں سے بھاگ آئے۔

مینجر کا دفتر ایر کنڈیشنڈ تھا اور اس لئے اس تھپڑ کی آواز کسی نے نہ سُنی تھی۔ مگر سب نے یہ ضرور دیکھا کہ للی جب باہر نکلی تو اس کا چہرہ سُرخ تھا اور اس کے ہونٹ بھنچے ہوتے تھے اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ للی تیز تیز چلتی ہوئی اپنی میز تک گئی، دراز کھول کر اپنی سب چیزیں نکال کر اپنے بیگ میں ڈالیں اور پھر بغیر کسی سے کچھ کہے وہ دفتر سے باہر نکل گئی۔ وہ جانتی تھی، کہ اب وہ اس دفتر میں پھر کبھی قدم نہیں رکھے گی۔

دفتر میں جتنے دوسرے نوجوان کلرک تھے سب ہی نے تو باری باری للی سے دوستی کرنے کی کوشش کی تھی مگر اُس نے ان میں سے کسی کو مُنہ نہ لگایا تھا، نہ کسی کے ساتھ سینما گئی تھی۔ نہ کسی ریستوران میں چائے پینے کی دعوت قبول کی تھی اور ایک دن جب کسی نے زیادہ اصرار کیا تھا تو اس نے کہہ دیا تھا "آئی ایم سوری، مگر شام کو مجھے موہن سے ملنا ہوتا ہے"۔

"موہن!" پتلی مونچھوں والے ٹامس نے حیرت سے پوچھا تھا۔ "یہ موہن کون ہے؟"
اور للی نے جواب دیا تھا "وہ میرا موہن ہے!"
"کیا تمہاری اس سے منگنی ہوئی ہے؟"
"ہاں، یہی سمجھو۔" للی نے جواب دیا تھا۔
"کب سے؟"
"بارہ برس سے۔"
"تو کیا تمہاری منگنی بچپن ہی میں ہو گئی تھی؟"
"ہاں، یہی سمجھو۔"
"مگر موہن! وہ تو ہندو ہوگا، اس سے تمہاری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"
للی نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا محبت کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ بیگ ہلاتی ہوئی دفتر سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد "چگی" داڑھی والے اکبر علی ہیجر کلرک نے اپنا رجسٹر بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔
"ارے واہ۔ اپنی للی تو لیلیٰ نکلی۔"
اور جب ٹامس نے پوچھا۔ لیلیٰ "ھواز شی؟" (—— WHO IS SHE ——) تو اکبر علی نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔
"وہ بھی ایک محبت کی دیوانی تھی، للی کی طرح۔"

●

لوکل ٹرین پریل کے اسٹیشن پر پہنچی اور للی دھکم پیل کر کے تھرڈ کلاس کے ڈبے کی بھیڑ میں سے باہر نکلی تو اس نے موہن کو حسبِ معمول کلاک کے نیچے کھڑا پایا۔
موہن اب اکیس برس کا جوان تھا۔ وہ ایک مل میں میکانک تھا اور اس کی نیلی شرٹ اور پتلون پر پڑے تیل کے دھبے اعلان کر رہے تھے کہ وہ سیدھا کام سے آ رہا ہے۔
"ڈارلنگ!" للی نے موہن کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا کیا؟"
"موہن نے مسکرا کر جواب دیا" صرف آدھ گھنٹہ۔ اتنی دیر میں صرف چار ٹرینیں گئی ہیں۔ کیوں آج دفتر میں کام زیادہ تھا یا اپنے مینجر سے ذکر چھیڑ رہی تھیں؟"
للی نے جلدی سے کہا۔ "اس شیطان کا تو نام مت لو۔ جی چاہتا ہے اس کا منہ نوچ لوں۔

مگر آج سے تمہیں کبھی انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نوکری چھوڑ آئی ہوں۔"

اتنے میں ٹرین چلی گئی تھی اور اگلی ٹرین آنے تک پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔

ٹی اسٹال کے پاس اپنی مقررہ بنچ پر بیٹھے ہوتے للی اور موہن بھجیا کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بھجیا ختم ہوگئی، مگر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ دوسری ٹرین آئی۔ مسافر ڈبوں میں سے اُترے، مسافر ڈبوں میں چڑھے۔ ٹرین چلی گئی۔ ایک بار پھر اسٹیشن پر سناٹا چھا گیا۔

رات ہوگئی۔ سٹیشن کی روشنیاں جل اٹھیں۔ ٹرینیں آتی رہیں۔ ٹرینیں جاتی رہیں۔ مسافر اُترتے رہے، مسافر چڑھتے رہے۔ للی اور موہن اسی جگہ بیٹھے رہے، باتیں کرتے رہے اور بھجیا خرید کر کھاتے رہے اور پیار بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر کار للی نے کہا "اچھا تو اب دیر ہوگئی ہے۔ مجھے جانا ہی چاہیئے۔"

موہن نے جیسے خواب میں کوئی بات سُنی ہو۔ "للی کچھ کہا تم نے؟"

"نہیں کچھ نہیں کہا۔" للی نے اُسے یقین دلایا۔

اور وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے میں کھو گئے۔

ایک کے بعد ایک دو ٹرینیں جنوب کو گئیں۔ تین ٹرینیں شمال کو گئیں، مگر وہ دونوں اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ یہاں تک کہ چائے اور بھجیا کی دکان بھی بند ہوگئی اور چائے والا جاتے جاتے اُن سے کہہ گیا۔ "ابھی آخری ٹرین آنے والی ہے۔ اس کے بعد صبح تک کوئی ٹرین نہیں ملے گی۔"

تب وہ دونوں چونکے۔ دُور سے ٹرین قریب آنے کی آواز دھیرے دھیرے بڑھتی جا رہی تھی۔

"تو کل تم دفتر نہیں جاؤ گی؟" موہن نے پوچھا۔

"نہیں، اب میں کبھی دفتر نہیں جاؤں گی۔"

"پھر میں تم سے کیسے ملا کروں گا؟"

"تمہارے بل کی شفٹ ختم ہونے سے پہلے میں یہاں آجایا کروں گی۔"

"اور اگر تمہارے ڈیڈی نے تمہیں اُس وقت گھر سے نہ نکلنے دیا؟"

"پھر میں کیسے آسکتی ہوں؟ تم ہی بتاؤ۔ پھر کریں تو کیا کریں؟"

"تو پھر ایک ہی راستہ ہے۔ کل ہی ہم شادی کر لیں گے۔"

للی کے کانوں میں ننھی ننھی گھنٹیاں بجنے لگیں اور اتنے میں ٹرین آگئی اور جو للی نے دھیرے سے کہا وہ ریل کی دھڑ دھڑاہٹ میں کھو گیا۔

موہن نے للی کا بازو پکڑا۔ "آؤ تمہیں گھر پہنچا آؤں۔" اور وہ دونوں سامنے والے ڈبے

میں سوار ہو گئے۔

●

باندرہ کی سڑکیں رات کے سناٹے میں سوئی ہوئی — صرف للی اور موہن کے قدموں کی آواز تھی اور فٹ پاتھ پر سونے والوں کے خرّاٹے۔

دُور کہیں کسی گھڑیال نے دو بجائے۔

موہن نے چلتے چلتے کہا "للی یاد ہے ماہم والی بستی میں جب ہم پہلی بار ملے تھے اُس وقت بھی رات کے دو ہی بجے تھے۔"

"بالکل یاد ہے۔ تم چوری سے اپنی گاگر لائن میں آگے رکھ رہے تھے۔"

"اور تم ڈنڈا ہاتھ میں لئے پہرا دے رہی تھیں اور تُتلا تُتلا کر کہہ رہی تھیں —— مال مال کے بھُل کچھ بنا دوں گی۔"

"مجھے ماہم والی بستی بہت یاد آتی ہے۔ وہاں ہم کتنے خوش تھے۔"

"مگر اب تو تم بہت اچھی فلیٹ میں رہتی ہو۔"

"ہاں، یہ گھر تو اچھا ہے مگر تم جو نہیں ہو وہاں ماہم کی بستی میں تو ہم دن بھر ساتھ کھیلتے تھے۔"

"یاد ہے جب میں نے بلیک بورڈ پر فادر ولیم کی تصویر بنائی تھی؟"

راستے کی روشنی میں للی نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا جہاں ہلکی نیلی نیلی دو لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور اس نے کہا "یاد ہے۔"

اور پھر للی کا گھر آ گیا۔

دوسری منزل پر جس فلیٹ میں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی، وہاں ایک کھڑکی میں روشنی ہو رہی تھی۔

موہن نے کہا۔ "لگتا ہے تمہارے ڈیڈی ممی جاگ رہے ہیں۔ تمہیں کچھ کہیں گے تو نہیں؟"

للی نے جواب دیا "فکر نہ کرو۔ وہ میرا کمرہ ہے اور اُس کی ویلیج کی، میرے پاس رہتی ہے۔ اچھا گڈ نائیٹ، میں کل ہی ڈیڈی سے بات کر کے شام کو تمہیں ملوں گی۔"

"تو پھر چار بجے ریل سٹیشن پر۔"

للی اندھیرے زینے پر راستہ ٹٹولتی ہوئی اُوپر چڑھ گئی اور جب تک اُس کے قدموں کی آواز آتی رہی۔ موہن وہیں سڑک پر کھڑا رہا۔

رلی "ریچ کی" سے دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی، تو سب سے پہلے سڑک والی کھڑکی کھولی۔ کتنا اچھا ہے میرا موہن! اُس نے سوچا "میری فکر میں اب تک سڑک پر کھڑا ہے"۔ پھر اُس نے ہاتھ کے خاموش اشارے سے موہن کو "بائی بائی" کہا اور جب مطمئن ہو کر موہن بھی ہاتھ ہلا کر چل پڑا۔ تب ہی وہ کھڑکی سے ہٹی۔

وہ مڑی ہی تھی کہ رلی کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کا باپ دروازے میں کھڑا تھا۔

●

پریل سٹیشن پر لوکل ٹرینیں آرہی تھیں۔ ٹرینیں جارہی تھیں۔ "فاسٹ" ٹرینیں دھڑ دھڑ کرتی ہوئی، پلیٹ فارم کو ہلاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ ایک بنچ پر رلی اور موہن بیٹھے تھے اور اُن کے درمیان میں کاغذ میں بھجیا رکھی تھی، مگر آج دونوں میں سے ایک کا ہاتھ بھی اُس چٹ پٹی مسالے دار بھجیا کی طرف نہ اُٹھ رہا تھا۔

"سو تمہارے ڈیڈی نے انکار کر دیا؟" موہن نے خاموشی کو توڑتے ہوتے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"انکار ہی نہیں کیا، موہن"۔ رلی بولی۔ "بہت کچھ کہا۔ شراب پیتے ہوتے تھے۔ سو گالیاں بھی دیں مجھے۔ تمہیں بھی بہت بُرا بھلا کہا"۔

"کیا کہا؟ معلوم تو ہو ان کو مجھ میں کیا بُرائی نظر آتی ہے؟"

رلی نے ایک دم جواب نہ دیا۔ جیسے بولتے ہوتے ہچکچا رہی ہو۔ اتنے میں ایک ٹرین آکر ٹھہر گئی۔ سارے ڈبے کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ مسافر اُترے، مسافر چڑھے۔ سب ڈبے جوں کے توں بھرے رہے۔ گاڑی پھر چل دی۔ اُترنے والے مسافر سیڑھیاں چڑھتے ہوتے پُل پر ہو لئے ــــ پلیٹ فارم پھر سنسان ہو گیا۔

اب رلی نے دھیرے سے کہا "ڈیڈی کہتے ہیں تم ــ تم ــ ہندو ہو، اور بولتے ہیں میں مر جاؤں گا پر اپنی بیٹی کی شادی ایک ہندو کے ساتھ نہ ہونے دوں گا"۔

"تمہارے ڈیڈی کرسچن ہیں؟"

"ہاں!"

"چرچ جاتے ہیں؟"

"پہلے کبھی کبھار سنڈے کو چلے جاتے تھے۔ اب تو انھیں شراب پینے سے فرصت ہی کب ملتی ہے جو وہ چرچ جانے کا سوچیں۔"

"اور جب فرصت ملتی ہے تب کیا کرتے ہیں؟"

"تم تو جانتے ہی ہو موہن۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔" رلی نے آواز کو دھیمی کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر جواب دیا۔ "ڈیڈی دارو کا دھندا کرتے ہیں۔"

اتنے میں دوسری طرف کی ٹرین آگئی۔ یہ اتنی بھری ہوئی نہیں تھی۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں سے پندرہ بیس مسافر اُترے۔ فرسٹ کلاس سے ایک بھی نہیں اُترا۔ ٹرین چل دی۔ پلیٹ فارم پھر سُنسان ہو گیا۔

"اور کیا کہتے ہیں تمہارے ڈیڈی؟" موہن نے ایک ایک لفظ کو چبا کر کہا۔

"کیا کرو گے سُن کر موہن؟ تمہارے بارے میں بُری بُری باتیں جو وہ کہتے ہیں، اُن کو دہرانا مجھے اچھا تھوڑا ہی لگتا ہے۔"

"پھر بھی میں جاننا چاہتا ہوں، وہ کیا کہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں میرے بارے میں؟ ــــــ میرے ہندو ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی اعتراض ہے اُن کو؟"

"ہے۔" رلی نے جواب دیا۔

"کیا ہے؟"

"وہ کہتے ہیں تم ایک لیبر ہو، رل میں مزدور ہو، تمہارے کپڑوں سے پسینے اور تیل کے دھبّوں کی بو آتی ہے انہیں۔"

"تو وہ دن بھول گئے ہیں جب ہم اور وہ دونوں گھرانے ماہم والی بستی کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے؟"

"اب وہ اُس بستی کی بات سننا نہیں چاہتے، موہن، وہ اُن جھونپڑیوں کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ وہ میرے باپ ہیں، میں اُن سے بحث نہیں کر سکتی۔ تم بتاؤ تمہارے بابا نے کیا کہا؟ وہ تو ہمیں آشیرواد دیں گے نا؟"

موہن جواب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک تیسری ٹرین آگئی۔ یہ پہلی ٹرین سے بھی زیادہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ جو اندر تھے وہ باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے اور جو باہر تھے وہ اندر گھسنے کے لئے زور لگا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی منٹ ٹرین کو ٹھہرنا پڑا۔ پھر بھی جب ٹرین چلی تو کئی مسافر جو اُترنا چاہتے تھے، وہ اندر ہی رہ گئے اور کئی جو اس میں چڑھنا چاہتے تھے وہ پلیٹ فارم پر کھڑے رہ گئے۔ اُن میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو میلا پاجامہ اور دھلی ہوئی قمیص پہنے ہوئے تھا، اس بنچ پر آکر بیٹھ گیا۔ جہاں موہن اور رلی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بنچ کے دُوسرے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا مگر منہ پھاڑے ہوئے ان دونوں کو اتنے تعجب اور غور سے دیکھ رہا تھا جیسے عجیب جانوروں کا جوڑا۔ اس نے اِس

سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

موہن نے اس آدمی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا "یہ نہ جانے کون ہے جو ہمیں یوں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ بابا کا جاننے والا نہ ہو؟"

"تو پھر کیا کہا تمہارے بابا نے؟" للّی نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔

موہن کو، جواب تک اس سوال سے کترا رہا تھا، جواب دینا ہی پڑا۔ "وُہ ـــــ وہ ـــــ بھی اس شادی کے خلاف ہیں، للّی۔"

"وہ کیا وجہ بتاتے ہیں؟"

"کہتے ہیں، ہندو ہو کر میں کرسچین لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں؟"

"کیوں، کرسچین لڑکیوں میں اُنھیں کیا بُرائی دکھائی دیتی ہے؟"

"وہ کہتے ہیں ـــــ کرسچین چھوکریاں بڑی خراب ہوتی ہیں۔ ہر مرد سے آنکھیں لڑاتی ہیں۔"

للّی کے سانولے چہرے پر سُرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ "کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو؟"

"نہیں نہیں، للّی یہ بات نہیں ہے۔ بھلا میں ایسا کیسا سوچ سکتا ہوں۔ مگر بابا کو کون سمجھاتے۔ تمہارے ڈیڈی کو بھی بُرا بھلا کہتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ دارو کا دھندہ کرتا ہے۔"

"اور تمہارے بابا کیا دھندہ کرتے ہیں؟"

موہن نے ہچکچا کر جواب دیا۔ "سٹے کا۔"

للّی کچھ کہنے والی تھی مگر اتنی دیر میں دوسری ٹرین آ گئی اور پلیٹ فارم پر پھر گہما گہمی شروع ہو گئی مگر وہ آدمی جو اُن کی بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا رہا اور اسی طرح اُن کو گھورتا رہا بلکہ اُن کو دیکھ دیکھ کر مُسکراتا رہا۔

گاڑی گئی تو للّی نے کہا "اب کیا ہو گا موہن؟"

موہن نے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں تو آج اسی فکر میں مل میں کام کرنے بھی نہیں گیا۔ اگر تمہارے ڈیڈی نے تمہاری شادی کسی اور سے کر دی تو میں جان دے دوں گا۔"

للّی بولی "تم کیا سمجھتے ہو، میں زندہ رہوں گی؟ ڈیڈی نے زبردستی کی تو میں زہر کھا لوں گی ـــــ موہن! تم مجھے تھوڑا سا زہر لا دو۔"

"زہر میں کہاں سے لاؤں گا۔ زہر پر تو کنٹرول ہے۔ ڈاکٹر کے چٹھی دیئے بنا زہر مل ہی نہیں سکتا۔"

تھوڑی دیر وہ چُپ چاپ بیٹھے رہے اور اُن کے بیچ میں بھیا اُسی طرح پڑی رہی۔ پھر نہ جانے کیسے پہلے للّی کی اور پھر موہن کی نگاہ ریل کی پٹڑی پر جم گئی۔ فولاد کی کالی پٹڑی جو ریل کے

پہیتوں کی رگڑ سے چمک رہی تھی۔ شاید دُور سے ریل چلی آرہی تھی۔ پٹری میں سے ایک عجیب زوں زوں کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی ـــ جیسے ستار کے تار کو کسی نے چھیڑ دیا ہو اور اب اُس کی جھنکار کی گونج رہ گئی ہو۔ جیسے کتنی ہی شہد کی مکھیاں بھن بھنا رہی ہوں۔ جیسے وہ پٹریاں کتنی عجیب انجانی زبان میں اُن سے کچھ کہہ رہی ہوں۔

اُن کی نگاہیں ریل کی پٹری پر جمی ہوئی تھیں کہ ایک دم دھڑ دھڑ کرتی ہوئی ایک ٹرین آگئی۔ اُن کے سامنے کی پٹڑی پر سے ٹرین کے کتنے ہی بھاری ہیبت ناک پہیے دھڑ دھڑ! تے ہوتے گزر گئے۔ پھر وہ ٹرین بھی چلی گئی، مگر وہ پٹڑی پہلے کی طرح چمکتی رہی، گنگناتی رہی، اُن سے کچھ کہتی رہی۔

اور پھر ایک ساتھ ان دونوں کی سمجھ میں آگیا کہ ریل کی پٹڑی اُن سے کیا کہہ رہی ہے۔

للی نے موہن کی طرف دیکھا۔

موہن نے للی کی طرف۔

اور دونوں کی نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا اور ایک ہی جواب۔ اس زندگی سے موت بہتر ہے اور موت وہاں اُن کے سامنے وہاں اُس ریل پٹڑی کی تلوار جیسی دھار پر اُن کا انتظار کر رہی تھی۔

اب قریب آنے والی ریل کی آواز سے ریل کی پٹڑیاں جھنجھنا اٹھیں۔

وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

ایک لمحے کے لیے انھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خاموشی سے اقرارِ محبت کیا۔ پھر للی کا نرم ہاتھ موہن کے سخت کھردرے اور مردانہ ہاتھ میں آگیا۔

اب ٹرین اُن کی طرف دھڑ دھڑاتی ہوئی آرہی تھی۔

ایک لمحہ، اور پھر وہ دونوں ریل کی پٹڑی پر کود جائیں گے۔ اُس ٹرین کے بھاری پہیے اُن کی مشکل آسان کر دیں گے۔ موت کی گود میں ان کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ سُلا دیں گے۔ اُن کی محبت کو امر کر دیں گے۔

"اے!"

ایک آواز نے اُن کو چونکا دیا اور اسی لمحے میں ٹرین آگئی اور ڈبے اُن کے پاس سے گزرنے لگے۔ للی اور موہن نے مُڑ کر دیکھا تو یہ وہی ادھیڑ عمر کا میلا پاجامہ، پھٹی قمیص والا آدمی تھا ـــ جو مسکرا کر بھجیا کی پڑیا کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"اپنی بھجیا تو ساتھ لیتے جاؤ۔" اُس نے چلا کر کہا۔

"بھجیا! چٹ پٹی مسالے دار بھجیا! نہ جانے کیوں بھجیا کا نام سُن کر اُن دونوں کے منہ میں

پانی آگیا۔

بھجیا! چٹ پٹی مسالے دار بھجیا!

اور اگر وہ مر گئے ہوتے تو بھجیا کیسے کھاتے؟"

ٹھنڈا میٹھا فالودہ کیسے پیتے؟

چاندنی رات میں جوہو کے کنارے نرم نرم ریت کا لمس! اپنے گالوں پر کیسے محسوس کرتے؟

مالا بار ہل پر جا کر ہینگنگ گارڈن میں کھلے ہوتے پھولوں کا نظارہ کیسے کرتے؟

وہ بھجیا نہیں تھی، وہ زندگی تھی جو اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ چٹ پٹے مسالے کی خوشبو کے ساتھ اُن کو واپس بُلا رہی تھی۔

اُترنے والے مسافر چڑھنے والے مسافروں سے دست و گریباں تھے ——— کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔

موہن نے للی کے کان میں چلّا کر کہا۔ "چلو، رسول میرج کر لیں؟ کیوں منظور ہے؟"

تو للی نے موہن کے کان میں چلّا کر کہا "ہاں ہاں منظور ہے۔"

"تو چلو، چرچ گیٹ چلیں۔"

اور یہ کہہ کر موہن نے للی کا ہاتھ پکڑا اور ڈبے میں گھسنے والی بھیڑ پر پل پڑا۔ کسی نہ کسی طرح وہ بھیڑ کے ریلے کے ساتھ اندر گھس ہی گئے۔

ٹرین چلی گئی۔

مگر وہ آدمی بنچ پر اُسی جگہ بیٹھا رہا۔

وہ بھجیا اُسی طرح پڑی رہی۔

پھر وہ آدمی آہستہ سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور بھجیا کی پڑیا اُٹھا کر کھانے لگا۔

تب چاتے والے نے اپنی دُکان سے آواز دی "کیوں چلے گئے وہ دونوں؟"

"ہاں چلے گئے۔"

"روز مجھ سے بھجیا لے کر کھاتے ہیں۔" چاتے والے نے کہا۔

"مگر اب وہ تمہاری بھجیا کھانے نہیں آئیں گے۔ اب وہ اپنے لئے خود چٹ پٹی مسالے دار بھجیا بنایا کریں گے۔"

"کیا تم ان کو جانتے ہو؟ کون ہیں یہ دونوں؟"

اور وہ جو کھٹائی کی چٹنی میں ڈبو ڈبو کر اور مزا لے لے کر بھجیا کھا رہا تھا۔ بولا "لیلیٰ مجنوں"

ADBI SATOON LAHORE
PUBLISHER BOOK SALER &.
GENERAL ORDER SUPPLIER
SAMAN ABAD LAHORE